U82245 . Date- 31-12-09

Title - HAYAAT-E-RAZA.

Creator - Sayyed Abdul Ghani.

Publisher - Muslim University (Aligarh).

Date - 1935

Pages - 104

Subjects - Sir Sayyed Ahmad Khan - Azeem Abad - Tazkira Mashaheer; Sir Sayyed Ahmad Khan - Tazkira - Rifqa; Raza Azeem Abadi; Aligarh Tehreek - Tazkira Mashaheer.

کرنل مقبول حسین سیریز نمبر ۲

حیاتِ رضا

یعنی

سوانح حیات قاضی سیّد رضا حسین صاحب رئیس پٹنہ (بہار) جو سر سیّد احمد خاں مرحوم کے خاص احباب میں اور ابتدا ء کار سے اُن کے معاون و مددگار تھے

مؤلفہ

مولوی سیّد عبد الغنی صاحب مرحوم بہاری متوسل سرکار عالی نظام خلّد اللہ ملکہ

جو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے

حسب ہدایت

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۵ء طبع ہوئی

ice Rs 6/-

مقبول سیریز

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۳۳ء کے صدر جناب لفٹنٹ کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) وزیر عدالت ریاست بہاول پور نے اس موقع پر تین ہزار روپیہ کی گرانقدر رقم کانفرنس کو مرحمت فرمائی تھی جو محترم معطی کے مشورہ سے اس غرض کے لئے مخصوص کر دی گئی کہ اس سے مفید علمی تاریخی کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جائے۔ جو مقبول سیریز کے نام سے موسوم ہو۔

چنانچہ گزشتہ سنہ ۱۹۳۴ء سے اس تجویز پر عمل شروع ہو گیا ہے اور یہ کتاب اسی سلسلہ میں شائع ہوئی ہے انشاء اللہ یہ مفید سلسلہ آیندہ بھی جاری رہے گا اور اس کے ذریعہ سے محترم معطی کی یادگار قائم رہیگی

خزینۂ معلومات مفت طلب کیجئے

چند سال سے کانفرنس نے اپنا بک ڈپو قائم کیا ہے جس میں اردو کے تمام مشہور مصنفین مثلاً نواب محسن الملک مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حافظ نذیر احمد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) وغیرہ کی تصنیفات موجود ہیں۔ جو مناسب نرخ پر فروخت ہوتی ہیں۔

بچوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت نیز فن تعلیم کے متعلق بھی متعدد و معتبر و مفید کتابیں اس بک ڈپو سے مل سکتی ہیں اس کے علاوہ گزشتہ چند سال میں خود کانفرنس نے جو عمدہ و دلچسپ کتابیں نہایت اہتمام سے حسن طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہیں مثلاً وقار حیات، حیات محسن، یاد ایام، خطبات عالیہ، فطرت اطفال، التربیۃ الاستقلالیہ سلاطین معبر، تاریخ ملیبار، رسالۂ اتالیق، بچوں کی تعلیمی ریڈریں، گنجینۂ اسکاوٹنگ صولت شیر شاہی، وغیرہ خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ عام فائدہ کے خیال سے باوجود ظاہری و معنوی محاسن کے ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئی ہیں، یہ کتابیں بھی کانفرنس بک ڈپو سے ملتی ہیں اور زیادہ خریداری پر تاجروں کو کمیشن بھی دیا جاتا ہے،

ان سب کتابوں کے تفصیلی حالات اور ان کی قیمتیں رسالہ "خزینۂ معلومات" سے معلوم ہونگی، آپ صرف ایک کارڈ لکھ دیجئے رسالہ خزینۂ معلومات جو ۲۵ صفحہ کا ہے دفتر سے محصول ڈاک لگا کر آپ کی خدمت میں بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ اس کو پڑھکر آپ اپنے مذاق و شوق کی کتابیں طلب کر لیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

قاضی سید رضا حسین صاحب مرحوم رئیس پٹنہ (بہار)
(جو سر سید مرحوم کی ابتداء کار سے معاون و مددگار تھے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شکریہ

حضرت والدی وسیدی مولوی عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جناب خان بہادر قاضی سید رضا حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق رکھتے تھے اور صاحب موصوف کا برابر تذکرہ فرمایا کرتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ قاضی صاحب موصوف کی سوانح حیات وہ اپنی زندگی میں شائع فرمائیں۔ انتقال سے چند سال قبل حضرت والد ماجد نے اس کام کی ابتدا کردی اور پورا خاکہ مرتب فرمالیا اور سوانح حیات کو مختلف عنوانوں کے تحت تحریر فرمانا شروع کردیا۔ چنانچہ پٹنہ اور سائیں سے ضروری مواد بھی حاصل فرمالیا۔ اور قاضی صاحب مرحوم کی ایک تصویر اور کئی خطوط بھی فراہم کرلئے۔

فروری ۱۹۱۸ء میں حضرت والد ماجد نے دولت آصفیہ کی سلک ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ انہیں وظیفہ حسن خدمت ملا اور اپنے وطن تشریف لے گئے۔

فرصت کی گھڑیوں میں سب سے پہلے جو کام والد صاحب مرحوم نے شروع فرمایا وہ قاضی صاحب موصوف کی سوانح حیات کی تکمیل تھی۔ خیال تھا کہ اس کام سے چند مہینوں میں عہدہ برآ ہو جائیں گے مگر مشیت ایسی نہ تھی۔ حضرت والد ماجد نے جون ۱۹۱۸ء میں انتقال فرمایا اور یہ سوانح نامکمل رہ گئی۔ حضرت والد ماجد کے انتقال کے بعد مسودہ میں نے اپنے پاس منگوا لیا مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کام کی تکمیل ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ میری نظر جناب محترم و معظم شمس العلما مولوی حافظ سید محب الحق صاحب قبلہ مدظلہ العالی ساکن عظیم آباد پٹنہ پر پڑی جو حضرت والد ماجد مرحوم کے مخلص دوست اور جناب قاضی صاحب مرحوم کے قریبی عزیز ہوتے ہیں صاحب موصوف حیدرآباد تشریف لائے ہوئے تھے اور میرے ساتھ فروکش تھے۔ میں نے انہیں مسودہ دکھلایا اور درخواست کی کہ جو باب نامکمل رہ گئے ہیں اور صرف خاکہ کی شکل میں ہیں

اُن کی تکمیل فرمادیں اور ساتھ ہی پورے مسوّدہ کی نظرثانی بھی فرمالیں۔ جناب موصوف نے ازراہ نوازش وکرم فرمائی میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور حیدرآباد ہی میں مقیم رہ کر اس کام کی تکمیل فرمائی۔ اگر جناب ممدوح اس کی تکمیل نہ فرماتے تو یہ کتاب کبھی پبلک کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔

تین سال قبل جناب محترمی نواب الحاج مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب المخاطب بہ صدر یار جنگ بہادر مدظلہ سابق صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی و آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی میں نے دوران گفتگو میں قاضی صاحب مرحوم کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا کہ مرحوم سر سید احمد خاں غفر لہ کے خاص احباب میں تھے اور اُن کے قومی کاموں میں شریک کار تھے۔ صوبہ بہار کے یہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا خیال دلایا چنانچہ والد ماجد مرحوم نے قاضی صاحب کے فیض صحبت سے عربی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد پچیس سال کی عمر میں انگریزی کی تعلیم شروع کی اور علی گڑھ کالج میں جاکر شریک ہوئے اور وہاں میٹرک کی تعلیم حاصل کی قاضی صاحب کی سوانح حیات کا مسوّدہ مکمل موجود ہے۔

نواب صاحب معزّ نے فرمایا کہ سر سید غفر لہ کے دوستوں میں کئی بزرگوں کی سوانح حیات منجانب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس شائع ہوچکی ہیں جن میں سے قابل تذکرہ نواب قارالملک مرحوم ہیں ایسی صورت میں قاضی صاحب مرحوم کی سوانح عمری کیوں نہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شائع کی جائے اور فرمایا کہ میں منجانب کانفرنس طبع کراؤں گا۔ چنانچہ میں نے پورا مسوّدہ جناب ممدوح کے سپرد کردیا جواب شائع ہو رہا ہے۔

میں ان دونوں بزرگوں کا تہ دل سے شکر گزار اور ممنون ہوں اگر ان حضرات کی کوشش میرے شامل حال نہ ہوتیں تو اردو ادب میں ایک مخلص قوم کے سوانح حیات کا اضافہ نہ ہوتا۔

اورنگ آباد (دکن)
۳ ستمبر ۱۹۳۵ء

سیّد محی الدین

فہرست مضامین

دیباچہ

قاضی سید رضا حسین صاحب مرحوم جن کے حالات اس کتاب میں پیش کئے جاتے ہیں بہار کے ایک معزز بزرگ تھے اور خاندانی شرافت و وجاہت کے علاوہ اپنے ذاتی محاسن یعنی عمدہ خصائل مضبوط کیرکٹر اور قومی خدمات کے لحاظ سے صوبہ بہار کی ایک ممتاز ہستی تھے۔

قاضی صاحب اُن چند بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کے آغاز میں قولاً و عملاً مدد کی، اور آخر عمر تک اُن کے شریک کار اور بعض اوقات رفیق سفر رہے۔

قاضی صاحب کے یہ حالات مولوی سید عبد الغنی صاحب بہاری نے لکھے ہیں جو صوبہ بہار کے ایک لائق فاضل اور پختہ سیرت و خصائل کے سنجیدہ و متین بزرگ تھے، اور قاضی صاحب سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ نیز آپ کو ایام طالب علمی میں علی گڑھ میں سرسید مرحوم کو دیکھنے کا موقع بھی ملا تھا، اس لئے جو حالات مولوی صاحب مرحوم نے قاضی صاحب کے لکھے ہیں وہ ذاتی معلومات پر مبنی ہیں اور اُن کے معتبر ہونے میں شبہ نہیں۔

جس زمانہ میں قاضی صاحب سرسید کے ڈپوٹیشن میں حیدر آباد تشریف لے گئے تو مولوی عبد الغنی صاحب مرحوم سرکار آصف جاہ کے سلک ملازمت میں داخل تھے اور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے وہاں بھی ان کو قاضی صاحب اور سرسید سے ملاقات کا موقع ملا۔

سوانح عمری کا یہ مسودہ مولوی سید عبد الغنی صاحب کے فرزند سعید سید محی الدین صاحب بی اے پرنسپل عثمانیہ کالج کے پاس تھا، جب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کو یہ معلوم ہوا تو یہ چاہا کہ سرسید کے بعض دیگر رفقاء کی طرح قاضی صاحب کے حالات بھی شائع ہو جائیں تاکہ اس دور آخر میں جن جن بزرگوں نے ملک و ملت کی کچھ خدمت کی ہے اُن کی یادگار باقی رہے۔

مولوی سید محی الدین صاحب نے خوشی سے یہ مسودہ عنایت فرمایا جو نظر ثانی اور ترتیب مضامین میں ضروری تغیر و تبدل کے بعد شائع کیا جاتا ہے، امید ہے کہ حسن قبول حاصل کرے گا، اور ناظرین قاضی صاحب مرحوم کی سبق آموز زندگی سے فائدہ اٹھائیں گے۔

خاکسار محمد اکرام اللہ خاں ندوی

سلطان جہاں منزل علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پہلا باب

ولادت، وطن و خاندان، عہد طفولیت، تعلیم و تربیت، فارسی قابلیت، عربی زبان کی استعداد، ریاضی سے واقفیت، انگریزی سیکھنے کا شوق، ملازمت -

ولادت سید رضا حسین خلف سید تفضل حسین ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ مطابق جولائی ۱۸۳۶ء کو ہولاس گنج (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے، تاریخی نام آغا میر ہے جس سے ان کا سنہ ولادت بحساب ہجری برآمد ہوتا ہے، نواب صادق علی خاں اختر نے جو اردو، فارسی دونوں زبانوں کے ماہر و شاعر تھے، تاریخی نام محمد ریاض الحسن تجویز کیا جس کو ایک قطعہ میں نظم بھی کر دیا تھا، لیکن ان کے بزرگوں نے سادہ نام رضا حسین ہی پسند کیا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوئے۔

ط قطعۂ تاریخ ولادت

کرم پیشہ سید تفضل حسین ۔۔۔ کہ ماہر بود و ہمہ علم و فن
قضا بارگاہ و قدر دستگاہ ۔۔۔ بہ تسخیر دل شہریارِ زمن
در آورد فرزندے اندر کنار ۔۔۔ بہ بخشائش ایزدِ ذوالمنن
چو اختر شنید این نوید نشاط ۔۔۔ ز شادی بگنجید در پیرہن
کہ تا گوہر و ش اسم تاریخیش ۔۔۔ بگفتا محمد ریاض الحسن

وطن و خاندان

صوبۂ بہار[1] میں گیا ریلوے لائن کے صورٹھی اسٹیشن سے پانچ میل مشرق کی جانب ضلع پٹنہ کی جنوبی حد کی انتہا پر مسلمانوں کی ایک مشہور بستی سائیں ہے اور اسی لائن کے بیلا جو اسٹیشن کے قریب جانب مشرق ضلع گیا کی شمالی سرحد کی ابتدا پر ہولاس گنج نام شرفا کی ایک بستی ہے، اول الذکر بستی سید رضا حسین کے اجداد پدری کا وطن ہے اور آخر الذکر اجداد مادری کا مسکن، یہ لوگ صوبۂ بہار کے ایک مشہور و معزز خاندان شاہ صاحبان بلخیہ کے ارکان تھے، پہلے محی الدین پور میں قیام پذیر تھے جو ایسٹ انڈین ریلوے کے اسٹیشن فتوحہ کے قریب دکھن کی جانب واقع ہے، محی الدین پور سے پہلے اس خاندان کا مسکن خاص قصبۂ بہار تھا جہاں وہ مسند ارشاد پر متمکن اور سجادہ نشینی کے مرتبہ پر فائز تھے۔

---

[1] یوں تو سارا صوبۂ بہار بہت سیر حاصل اور سرسبز و شاداب ہے، لیکن اس خطہ کو جس کی شمالی حد گنگا، جنوبی صوبۂ اڑیسہ مغربی دریائے سون اور مشرقی ضلع بھاگل پور کی سرحد ہے خاص کر یہ شرف حاصل ہے کہ باعتبار شمالی حصہ کے ادھر کی زمین بلند، جنگل کی زہریلی ہوا سے پاک، کمزور کرنے والی رطوبت سے مبرا، اور مسلمان نجباء و شرفا کی بستیوں سے سراسر معمور ہے، اس خطہ کے اکثر شہر، قصبے، اور بڑی چھوٹی بستیاں بجائے خود دلکش و دلربا قدرتی مناظر رکھتی ہیں، جا بجا درختوں کے بہت ہی خوش نما جھنڈ پائے جاتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور بڑے بڑے قدرتی مناظر اور اعلیٰ نزہت گاہیں بھی ہر طرف باغبان قدرت نے اپنی فیاضی سے دل و دماغ کی ضیافت کیلئے مہیا کر رکھی ہیں۔

گیا ریلوے لائن کے بیلا اسٹیشن سے چھ سات میل مشرق کی جانب خوش نما و خوش فضا بودھ اور ہندو مذہب کے آثار قدیمہ سے معمور اور دو ہزار سال سے زیادہ کے کھدے ہوئے سات غاروں سے مالا مال برابر[2] کی پہاڑیاں[3] ہیں جو ہمیشہ رشیوں، جوگیوں، ولیوں، فقیروں کی ملجا و ماویٰ رہی ہیں، اور قصبۂ بہار سے کوئی دس میل کے فاصلہ پر گرم و سرد آب مصفا کے بیسیوں قدرتی چشموں اور سرسبز و شاداب درختوں، جھاڑیوں اور بیلوں سے نقرئی گھٹ

---

[2] امپیریل گزیٹر آف انڈیا متعلق ضلع گیا و پٹنہ۔ [3] ساتوں غاروں کا نام سات گھر ہے اور بڑا نے نقشوں میں ان پہاڑیوں کا نام کرم شا کی پہاڑیاں ہے (امپیریل گزیٹر آف انڈیا)

فرخ سیر بادشاہ نے محی الدین پور اور اس کے آس پاس کے تین گاؤں گادھوگڈھ مظفر پور اور دولت پور حضرت سلطان معمور شاہ کی خانقاہ کے لیے عطا کیے تھے، یہ بزرگ سید رضا حسین کے جد مادری طہارت التوحید کے پردادا اور بہت بڑے درویش و مرجع خاص و عام تھے، یہ گاؤں اب تک اسی خاندان کے لوگوں کے قبضہ میں ہیں، سید رضا حسین کی والدہ کو بھی اس جائداد میں سے ترکہ ملا تھا،

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲) کی دھانی پوشاکیں پہنے ہوئے راجگیر کی وہ پُر لطف، خوش سواد، و صحت بخش پہاڑیاں ہیں[ف۲۲] جہاں تپشیا کرکے گوتم بودھ نے اپنے نفسانی و شہوانی جذبات کو پامال کرکے اُن پر غلبہ حاصل کیا، اور جہاں بیٹھ کر مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ نے عرفان و ایقان کے بلند مرتبہ پر عروج کیا تھا، سو تھ بہار ریلوے پر اگر کیا سے لکھی سرائے تک چلے جاؤ تو بہت سے ایسے فرحت بخش و مسرت انگیز روح پرور منظر ملیں گے کہ بے اختیار یہ شعر زباں سے نکل جائے گا:

خوش گلشنے ست حیف کہ گلچین روزگار فرصت نمی دہد کہ تماشا کند کسے

صوبۂ بہار کے اس حصہ کی صوبہ کی آب و ہوا معتدل و معین صحت ہے، یہاں نہ تو موسم سرما میں برف گرتی ہے نہ گرمیوں میں لو چلتی ہے، بارش کی نہ تو راجپوتانہ کی طرف قلت ہے اور نہ منی پور و آسام کیسی کثرت، یہاں کے باشندے اپنی ذہانت و ذکاوت کے لحاظ سے ممتاز ہیں، اس مردم خیز خطہ سے سینکڑوں اولیا اللہ علما و فضلا اور شعرا و کاملین اٹھے، جن میں سے شارح آداب المریدین و صاحب مکتوبات صدی مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری مصنف شرح حضرات خمس و دیگر کتب تصوف حضرت حسین[ف۲۳] نوشہ توحید، ملا محب اللہ مصنف سلّم و مسلّم مولوی غلام یحییٰ المحشی میر زاہد رسالہ اور مرزا عبدالقادر بیدل کے نام ہمیشہ علمی حلقوں میں عزت و فخر کے ساتھ یادگار رہیں گے،

ف۲۲ دیکھو امپیریل گزیٹر آرٹیکل راجہ گرہ۔

ف۲۳ یہ بزرگ سید رضا حسین کے اجداد مادری میں سے ۳۳ ویں پشت میں ہیں، ان کی تصانیف نظم و نثر میں سے اگرچہ وہی کتاب حال میں طبع ہوئی ہے جس کا نام اوپر لکھا گیا، لیکن بہار و پٹنہ کے لوگوں کے پاس ان کی اور تصانیف موجود ہیں۔

رضا حسین بلحاظ ایں نجیب الطرفین سید تھے، پدری نسب کا سلسلہ حضرت امام محمد باقرؑ کے واسطہ سے اور مادری نسب کا حضرت علی اصغر بن امام زین العابدین کے واسطے سے حضرت سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔ مادری خاندان جو مشہور بزرگ حضرت ابراہیم ادھم قدس سرہٗ کی اولاد سے ہے، دینی و دنیوی اور ظاہری و باطنی دولت و حشمت کے لحاظ سے ہمیشہ معزز و ممتاز رہا،

سید رضا حسین کے پدری و مادری سلسلہ کے اسلاف اپنے زمانہ قیام ہندوستان میں برابر سجادۂ طریقت و مسندِ فقر پر متمکن رہے اور جاگیر و وظائف سلطانی کی بدولت، اطمینان و فارغ البالی سے مخلوق خدا کی خدمت کرتے رہے، اس سلسلہ کے اکثر بزرگ اس مرتبہ کے تھے کہ ہزاروں آدمی اُن کے حلقۂ ارادت و سلسلۂ بیعت میں داخل تھے، ان بزرگوں کی کرامتوں اور خوارق عادات کی روایات اس خاندان میں اب تک نقل ہوتی چلی آتی ہیں، او بعض بزرگوں کے مزارات متبرک آج تک اب تک خوش اعتقاد زائرین کے لئے جاذب توجہ ہیں۔

سید رضا حسین کے اجدادِ پدری میں قاضی سید رستم علی بن سید نور اللہ جو ان کے پردادا تھے اور اجدادِ مادری میں سید طاہر التوحید بن سید شاہ فہیم اللہ جو سید رضا حسین کے نانا تھے، پہلے شخص ہیں جو شاہی حلقۂ ملازمت میں داخل ہوئے، قاضی رستم علی اپنے زمانہ کے بڑے ذہین و طباع اور صاحب رسوخ و اقتدار شخص تھے، اپنے کریمانہ اخلاق اور شریفانہ طرز عمل کی وجہ سے لوگوں میں ہر دلعزیز تھے اور عام طور پر عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

یہ زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دورِ حکومت کا تھا، اور تالیف قلوب کی حکمت عملی پر عمل کیا جاتا تھا، نیز ذاتی لیاقت و قابلیت کے علاوہ شرافت و نجابت خاندانی کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، اس لئے کمپنی کے حکام نے قاضی رستم علی صاحب کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا اور اُن کو حکومت سے وابستہ کرنا مناسب سمجھا، چنانچہ قاضی صاحب پہلے ضلع پٹنہ کے پرگنہ سانڈا، نوبت پور اور بلیا کے قاضی مقرر ہوئے، بعد ازاں فرق کمشنری کی خدمت بھی اس پر اضافہ کی گئی، انہوں نے

تا دم واپسیں یہ دونوں خدمتیں قابل اطمینان طور پر انجام دیں، اور گویا اپنی خدمتیں اپنے خلف اکبر رشید قاضی سید اولاد علی کے لئے ترکہ چھوڑ گئے، قدر دان حکام نے ۱۷۹۶ء میں مرحوم کی لائق و قابل اولاد کو بھی ان تینوں پرگنوں کا قاضی اور فرق کمشنر مقرر کیا جب انہوں نے معقول مدت تک یہ دونوں خدمتیں خوش اسلوبی سے انجام دیں تو حکام بالا دست نے ازراہ قدردانی کو تھانہ جہاں آباد، داؤد نگر اور ارول کا منصف مقرر کیا، اور وہ کافی مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے، آخر عمر میں وظیفہ لیکر سبکدوش ہوئے، چونکہ انہوں نے اپنے فرائض قابلیت و نیکنامی سے ادا کئے تھے، اس لئے حکام نے ان کے ہونہار فرزند قاضی تفضیل حسین صاحب کو ان پرگنوں کا قاضی مقرر کیا، اور عدالت دیوانی کی خدمات اس پر اضافہ کیں، ان کی اعلیٰ قابلیت و لیاقت کا حکام کے دل پر خاص اثر تھا، اس لئے وہ تدریجاً ترقی کر کے صدر اعلیٰ کے معزز عہدہ پر پہنچے۔

سید رضا حسین کے نانا سید طہارۃ التوحید[1]، چھ بھائی تھے، یہ اپنے بھائیوں میں دو سے چھوٹے اور تین سے بڑے تھے، چونکہ خاندانی اعزاز کے علاوہ علمی فضیلت بھی رکھتے تھے، اس لئے شعبۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کی، لارڈ وارن ہسٹنگز نے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ قائم کیا تھا، جو گویا پہلا شاہی کالج تھا، یہ کالج میں مدرس مقرر ہوئے، اس کے بعد سرکار کمپنی نے ان کو صوبۂ بہار کے چند پرگنوں کا قاضی اور فرق کمشنر مقرر کیا، کچھ مدت بعد منصف کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اخیر میں پنشن لیکر خانہ نشین ہو گئے،

مذکورۂ بالا حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید رضا حسین کا خاندان ہر لحاظ سے صوبۂ بہار کا ایک ممتاز خاندان تھا۔

---

[1] سید طہارۃ التوحید کے دو بیٹے تھے سید محمد واحد اور سید حمید الدین، دونوں اپنی ذہانت و قابلیت کے لحاظ سے ممتاز تھے، اول الذکر صدر امین (منصف درجہ اول) مقرر ہوئے، اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد بسلسلہ وفاداری و دلیری معقول پنشن اور وظیفہ حاصل کر کے خانہ نشین ہو گئے، ثانی الذکر نے زیادہ عمر نہ پائی صرف عہدہ منصفی تک ترقی کی، اس کے بعد موت نے جوہر قابلیت ظاہر کرنے کی مہلت نہ دی۔

سیّد رضا حسین کا عہدِ طفولیت

جس زمانہ میں سید رضا حسین پیدا ہوئے دولت مغلیہ کے آثار حکومت مٹ رہے تھے، اور جدید اجنبی حکومت اس کی بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی، پرانے آئین و قوانین بدل چکے تھے، ملک میں بڑی حد تک امن و سکون تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کو صوبۂ بہار کے اختیارات دیوانی سے ہوئے، قریباً ستر برس گزرے تھے اور لارڈ کارنوالس کے بندوبست استمراری کو بیالیس سال ہو چکے تھے، مسلمانوں کے جن جن خاندانوں میں تھوڑی بہت منہائیاں (معافیاں) ائمہ التمغا اور لاخراج زمینیں ضبطی سے محفوظ رہ گئی تھیں، وہ سب بہت خوش و خرم اور فارغ البال تھے اس عہد میں ضروریات زندگی نے ایسی غیر متناہی وسعت نہیں پیدا کی تھی جو آج نظر آتی ہے، نہ یورپ و امریکہ کی جدید مصنوعات نے ہماری معاشرت میں داخل ہو کر وہ تباہی پھیلائی تھی جس نے آج ہم کو تہ و بالا کر دیا ہے، اس وقت ملکی مصنوعات کی قدر تھی اور اہل حرفت و صنعت اپنے اپنے پیشوں میں کامیاب تھے، اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے، لوگوں کا دار و مدار ملازمت پر نہ تھا، اور نہ ملازمت ایسی عنقا صفت تھی کہ تلاش و جستجو پر بھی ہاتھ نہ آئے، اس وقت حکومت کی پالیسی "تالیف قلوب" تھی، شرفاء کی قدر کی جاتی تھی اور ان کو حصول معاش میں زحمتیں نہیں پیش آتی تھیں، عہدوں کا مدار عربی و فارسی کی لیاقت پر تھا، اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنا قابلیت کا اعلیٰ معیار تھا، اس وقت کے لحاظ سے جو اعلیٰ عہدے ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے، ان میں سے اکثر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھے، مسلمان اپنی انتظامی قابلیت اور صدیوں کے تجربہ حکومت کی بدولت اس کے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے، انگریزی زبان کو ابھی تک اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لئے مشرقی علوم کے تعلیم یافتہ ہر جگہ کامیاب و بارسوخ تھے، بہار کے قدیم طرز کے تعلیم یافتہ شرفا اپنے صوبہ کے باہر بھی کامیاب تھے، خود کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کے بعض اعلیٰ مدرسین اور صدر دیوانی عدالت کے اہلکار مختلف عہدہ دار اور ممتاز وکلا بھی صوبۂ بہار کے شرفا میں سے تھے، درحقیقت یہ زمانہ ایسے سکون و اطمینان کا تھا، جیسا کسی خوفناک آندھی کے آنے یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔

تعلیم و تربیت ہم نے اوپر بتایا ہے کہ سید رضا حسین کس ماحول میں پیدا ہوئے وہ ایک معزز و شریف

خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس میں مشرقی علوم کا رواج تھا، اور تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام۔ عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جس اطمینان و فارغ البالی کی ضرورت ہے وہ بھی میسر تھی، اس لئے ابتدا ہی سے اُن کی تعلیم پر توجہ کی گئی۔ لیکن اُن کی ابتدائی تعلیم کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے، صرف اتنا معلوم ہے کہ فارسی کی ابتدائی کتابیں اُنہوں نے شیخ ثابت علی مرحوم (ساکن ابدال چک) سے پڑھیں جن کو قاضی سید تفضل حسین صاحب نے اپنے صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے مامور کیا تھا، عربی میں میبذی و شرح ہدایۃ الحکمۃ تک ان کی درسی تعلیم کا پتہ چلتا ہے، لیکن جن لوگوں کو اعلیٰ ذوق ہوتا ہے وہ درسیات پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ذاتی کوشش و کاوش اور مطالعہ سے اپنی قابلیت بہت کچھ بڑھا لیتے ہیں، اس کے علاوہ علماء و ارباب فن کی صحبت و ہمنشینی دماغی ترقی و تربیت میں خاص طور پر معاون ثابت ہوتی ہے۔ سید رضا حسین نے بھی اگرچہ باقاعدہ طور پر درسی تعلیم زیادہ نہیں پائی تھی، لیکن اپنی ذہانت، ذکاوت، ذوق سلیم، اصابت رائے کی بدولت اُنہوں نے علمی حیثیت سے خاصی ترقی کرلی تھی۔

فارسی قابلیت

اس عہد میں شرفا کے لئے فارسی کی مہارت ایک ضروری چیز تھی، جس کے بغیر چارۂ کار نہ تھا، اس لئے سید رضا حسین نے اپنے شوق و محنت اور مسلسل کتب بینی کے ذریعہ سے فارسی میں خاص قابلیت پیدا کی۔

اس زمانہ میں مولوی محمد احسن صاحب بلگرامی جو فارسی کی ایک خاص طرز تعلیم کے موجد اور ارژنگ فرہنگ وغیرہ کتابوں کے مصنف تھے، اُن کی فارسی قابلیت و نظم و نثر نگاری کا شہرہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر تھا، سید رضا حسین نے اُن سے فارسی نثر نویسی سیکھی تھی اور ان کی بعض[1] تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نثر نویسی میں خاصی لیاقت پیدا کرلی تھی۔

---

[1] سید رضا حسین نے ایک رقعہ کسی بزرگ (غالباً اپنے اُستاد مولوی محمد احسن صاحب) کو لکھا تھا، اور اس کی نقل اپنے قلم سے اُس سفینہ میں کی تھی جو اُن کے بھانجے سید عبدالحی صاحب کی اعانت سے عاریتہً مجھے ملا ہے۔ یہ رقعہ حسب ذیل ہے:

قبلہ و کعبہ تسلیمات عرض دارم۔ ہمایوں صحیفہ با ہدیۂ معظم سر عزت بفلاک رسانید، ادائے شکرش ہمچوں کرم او را بضاعت استعداد ناچوں عبارتے و لفظے موجود نیست، اگرچہ بے مائگی خویشتن را عرضہ نہ ہم چہ کنم غزل اصلی و موزونی مطلع اش

عربی زبان کی استعداد سید رضا حسین نے اپنی محنت و کوشش سے عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کرلی تھی، سیر، تاریخ و تصوف کی عربی کتابیں بے تکلف مطالعہ کرتے اور سمجھتے تھے، راقم نے ان کو مختلف زبانوں میں علم ادب کی ابتدائی کتابیں چند لوگوں کو پڑھاتے بھی دیکھا، اُنہوں نے اپنے سفینہ میں جو عبارتیں، نظمیں اور مضامین سیرت ابن ہشام، تفسیر کبیر، تفسیر کشاف، فتوح الغیب، فصوص الحکم وغیرہ سے نقل کئے ہیں وہ بھی راقم کے مشاہدہ کے موئید ہیں۔

علاوہ اس کے جب ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن مجید کو پورے طور پر سمجھیں تو اپنی عمر کے آخر دور میں مولانا محمد کمال سے بالاستیعاب سبقاً سبقاً پڑھا۔

ریاضی سے واقفیت سید رضا حسین انگریزی طرز کے علم حساب و اقلیدس سے بھی واقف تھے یہ چیزیں ان کے تحصیل علم کے زمانہ میں عربی و فارسی کے نصاب میں داخل نہ تھیں، وہ جو کچھ جانتے تھے اس پر ایسا عبور رکھتے تھے کہ کوئی معلم آج بہتر طریقہ تعلیم کے ولپر اسکا نقش نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اُنہوں نے یہ دونوں فن پڑھائے اُن کو حساب میں نہ صرف عمل کرنے کے قواعد میں مشق تھی بلکہ قواعد کی اصلی بنیاد اور لم کو بھی بخوبی سمجھتے تھے، چنانچہ راقم کو بھی عربی کی تحصیل کے زمانہ میں اُنہوں نے حساب کے چاروں پہلے قاعدے مع وجوہ و دلائل سکھائے، اور جمع متوالی کا قاعدہ بتایا تھا۔

انگریزی سیکھنے کا شوق سید رضا حسین کو بچپن میں باقاعدہ طور پر انگریزی پڑھنے کا موقع نہ ملا، اُن کے بچپن کے زمانہ میں انگریزی کو یہ اہمیت حاصل نہ تھی، البتہ پبلک لائف میں قدم رکھنے کے بعد اُنہوں نے انگریزی سیکھنے کی ضرورت محسوس کی لیکن چونکہ یہاں ہم ان کی تعلیم کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷) درپے حیرت با دل محزون ہم کارے دگر کرد۔ خدمت اختیار مولوی سید امین اللہ صاحب مدیہ موسومہ شان بود ازیں رسانیدہ می آید، جناب مولوی محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ بتاریخ چہار دہم جمادی الاولیٰ و جناب غفران مآب حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ بتاریخ پنجم جمادی الاولیٰ ازیں جہان فانی رحلت فرمودہ اند، عولیفہ رضا حسین،

تربیت و علمی قابلیت کے حالات لکھ رہے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی سیکھنے کے سلسلے میں اُنہوں نے جو کوشش کی اُس کا ذکر اسی موقع پر کر دیا جائے۔

جب سید رضا حسین نے یہ دیکھا کہ ہوا کے رُخ پر چلنا اور زمانہ کا ساتھ دینا ضروری و ناگزیر ہے تو ایک لائق و ذی استعداد انگریزی داں کو نوکر رکھا، اُس سے انگریزی بھی شروع کی اور اضافۂ معلومات کے لئے انگریزی زبان کی عمدہ، منتخب اور بلند پایہ اخلاقی و فلسفی کتابوں، لکچروں اور اسپیچوں کا ترجمہ سننا بھی شروع کیا، چنانچہ انکی بیاض میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اسمائلس کی مشہور کتاب کیرکٹر ریڈ کی خلاصی، ٹوڈ کی ہینول بک، ڈی مارک، مسٹر وایری کے بعض مضامین اور کیشب چندر سین کے بعض لکچر جو خود اُنکے قلم کے لکھے ہوئے ہیں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں، مگر ایک اجنبی زبان سیکھنے کے لئے کافی وقت درکار ہے، اور بچپن کا زمانہ گزر جانے کے بعد جب انسان دنیا کے مشاغل اور ضروری فرائض میں منہمک ہو جاتا ہے کسی زبان کو باقاعدہ طریقہ پر سیکھنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔

اسلئے وہ انگریزی میں کوئی خاص ترقی نہیں کر سکے، اس کے علاوہ ان کو انگریزی کی ضرورت تھی، حکام وقت سے مراسلت اور واقعات و حوادث زمانہ سے ہر وقت واقفیت حاصل کرنے کے لئے اور یہ ضرورت ایک انگریزی داں شخص کو نوکر رکھ لینے سے بخوبی رفع ہو سکتی تھی جسکی استطاعت ان کو حاصل تھی، اس لئے وہ ہمیشہ ایک انگریزی داں کو ملازم رکھتے تھے، نیز بعض دوسرے قابل انگریزی داں بھی ہمیشہ اُن کی صحبت میں رہے، ان وجوہ سے انگریزی میں ترقی کرنے کا کوئی زبردست جذبہ اُن میں پیدا نہ ہوا، اُن کی کوئی ضرورت انگریزی سیکھنے پر منحصر نہ تھی، مگر سید رضا حسین چونکہ ایک ذہین شخص اور ذکاوت طبع کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے، اس لئے باوجود باقاعدہ انگریزی تعلیم نہ پانے کے باعتبار وسعت معلومات اور صاف اور سُلجھے ہوئے خیالات کے ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص معلوم ہوتے تھے۔

جب ان کو قرآن مجید سمجھنے کا شوق ہوا تو اُنہوں نے مرزا پور مشن پریس کا چھپا ہوا بائبل کا نسخہ منگوایا، اور اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اچھی طرح سمجھا، میں نے یہ نسخہ اُن کو نشست

کے کمرہ میں بارہا مغرب کے بعد پڑھوا کر ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے، جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے اس کا علم بھی ضروری ہے، غرض سید رضا حسین ایک طالب علمانہ ذوق کے شخص تھے اور عمر کے کسی حصہ میں کسی چیز کے سیکھنے سے بھی ان کو عار نہ تھا۔

ملازمت

اگرچہ کسی معتبر تحریر یا یادداشت سے صراحتہً معلوم نہیں ہوا لیکن جس قدر قابل وثوق مواد مجھے دستیاب ہوا ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ جب سید رضا حسین کے والد قاضی سید تفضل حسین صاحب نے اعلیٰ عہدہ پر ترقی پائی تو اس صورت میں وہ قاضی کے عہدہ کی خدمت جو بسلسلہ رجسٹراری کے تھی انجام نہیں دے سکتے تھے، اور چونکہ یہ عہدہ تین پشتوں سے برابر اسی خاندان میں چلا آتا تھا، اس لئے اس کو ہاتھ سے دینا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا، غالباً اسی سبب سے اُنھوں نے اپنے فرزند اکبر سید رضا حسین کو جو اگرچہ ابھی نوجوان اور کمسن تھے مگر اس خدمت کے انجام دینے کی قابلیت رکھتے تھے، اس موروثی عہدہ کے قبول کرنے کے لئے اشارہ کیا، غرض جو وجہ بھی ہو، سید رضا حسین ۱۹۔۲۰ سال کی عمر میں اتفاقاً قاضی سید رضا حسین بن گئے۔

جون ۱۸۵۶ء میں جبکہ قاضی سید رضا حسین کی عمر ۲۱ سال کی تھی اُن کے والد نے رحلت کی، لائق و نوجوان فرزند نے ایّام غدر تک مسند قضا کو زینت بخشی اور اپنی خدمت خوش اسلوبی سے انجام دی، غدر نے ملکی انتظام کو تہہ و بالا کر دیا، دفاتر کا شیرازہ بکھر گیا، خود گورنمنٹ مشکلات و مصائب میں مبتلا ہو گئی، اس حالت میں محکمۂ قضا کی خبر کون لیتا، لیکن جب یہ پُرآشوب زمانہ گزر گیا اور حکومت کو اطمینان نصیب ہوا، اور بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگلستان کی شاہی حکومت قائم ہوئی، تو قاضی سید رضا حسین نے گیا کی عدالت دیوانی میں بزمرۂ عمال سرکاری ملازمت اختیار کی کچھ زمانہ تک وہاں کام کیا، پھر اس ملازمت سے رخصت حاصل کر کے مظفرپور ضلع ترہت پہنچے یہاں عدالت دیوانی کے سررشتہ دار مقرر ہوئے اور گیا کی خدمت سے استعفا دے دیا،

دوسرا باب

شباب، توبہ و بیعت

شباب جیسا کہ انسان قوائے ملکیہ و بہیمیہ کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ایک عجیب و غریب مخلوق ہے، ویسا ہی اس کی زندگی کا وہ حصہ جس کو جوانی یا "شباب" کہتے ہیں انسان کے ایام حیات میں سب سے زیادہ عجیب و حیرت انگیز ہے، یہ زمانہ اختلاف قویٰ کے لحاظ سے ۱۸۔۲۰ سال کی عمر سے شروع ہو کر چالیس بیالیس سال کی عمر تک ختم ہو جاتا ہے، اس خاص زمانہ میں سارے قوائے بہیمیہ عروج و کمال پر ہوتے ہیں اور قوائے ملکیہ گویا عالم طفولیت میں ہوتے ہیں یا سکون و پژمردگی کی حالت میں، عمر کی اس منزل پر پہنچ کر ان دونوں قوتوں میں جنگ و کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اس جنگ میں عموماً (الا ماشاء اللہ) قوائے بہیمیہ کو غلبہ حاصل ہوتا ہے، البتہ جہاں قوت ملکیہ زبردست ہوتی ہے وہاں قوائے بہیمیہ شیطانیہ کو پسپا ہونا پڑتا ہے، لیکن یہ صورتیں شاذ ہیں، صرف خدا کے منتخب و برگزیدہ بندے اس کشمکش میں شیطانی قوتوں پر توفیق الٰہی سے فتح پاتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی خدا کے بہت سے نیک بندوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ قوائے ملکیہ کے چند روز تک قوائے بہیمیہ کا تابع رہنے کے بعد وہ سنبھل جاتے ہیں، اور آخر کار جب خدا تعالےٰ کی رحمت کاملہ جوش میں آتی ہے تو ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، کسی شخص کو لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے، کس کو خبر ہے کہ یہ تجلی ربانی کب ظاہر ہوگی اور کس وقت بندے کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیگی، گناہ سے توبہ کر لینے کے بعد بندہ بمصداق التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہے) گناہ سے پاک صاف ہو کر رحمت ایزدی کا امیدوار ہو جاتا ہے، جیسا کہ اوساط الناس کے طبقۂ صالحین و کاملین میں سے حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ و

فضیل عیاض قدس سرہما جیسے اولیاء کے سوانح وحالات سے ظاہر ہے، خیر یہ لوگ تو مرتبۂ کمال کو پہنچے، معمولی لوگوں میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ بہت سے گم گشتہ رہ قعرِ ضلالت سے نکل کر صلاحیت اختیار کر لیتے ہیں۔

قاضی سید رضا حسین بھی اوساط الناس سے تھے، گردوپیش کے حالات اور تقاضائے عمر نے اُن کو بھی ہوا و ہوس میں مبتلا کر دیا، اور اُن کی جوانی نے بھی اپنا رنگ دکھایا، چونکہ سارے اسباب فراغ اور آزادی حاصل تھی اس لئے "الشباب شعبۃ من الجنون" (جوانی بھی جنون کا ایک شعبہ ہے) کے مطابق ان کو بھی اپنے نفس پر قابو نہ رہا، عین شباب کا عالم، دنیا کے افکار سے بے نیازی، اور اس عہد کی سررشتہ داری کا عہدہ، اور وہ بھی مظفر پور جیسی جگہ میں اس کے علاوہ جن ہستیوں کا لحاظ و خیال ایسے کاموں سے روکتا اُن کا دنیا سے اُٹھ جانا، نیز بدنصیبی سے تعلیم کا ادھورا رہ جانا، اور سوسائٹی میں مذہبی زندگی کا فقدان، یہ سب ایسے اسباب تھے جنھوں نے قاضی رضا حسین کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا، اور وہ نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے، دن عید تھی اور رات شب برات، محفل عیش و نشاط برابر گرم رہتی تھی، مگر لہو ولعب کا یہ ہنگامہ زیادہ دنوں تک نہ رہا، گرنا اتنا بُرا نہیں جتنا گر کر نہ اٹھنا بُرا ہے، سہو وخطا تو انسان کی شان ہے وہ خطا نہ کرے تو کون کرے، گناہ سے لذت آشنا ہو کر اس سے توبہ کرنا زیادہ لائق قدر ہے، کسی بزرگ نے خوب فرمایا ہے "کاش کردے دگر گشتے" غرض قاضی صاحب نے اس کوچہ کو سرسری طور پر طے کر کے بازگشت کی۔

توبہ و بیعت

خطا وگناہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، بڑے بڑے انسانوں سے لغزشیں ہوتی ہیں، لیکن جب تک انسان کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوتا، بُرائی کا احساس اُس کے دل میں موجود رہتا ہے، اور آخر کار ایک وقت آتا ہے کہ کوئی معمولی سا واقعہ تازیانہ کا کام دیتا ہے اور انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے، گناہ پر متنبہ ہو کر تائب ہو جانا بھی سعادت و خوش بختی ہے، جب کوئی انسان نفس کی ہوا و ہوس پر غالب آ کر توبہ کرتا ہے تو اس توبہ میں بھی ایک عجیب لذت محسوس ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض شقی آخر ایام حیات تک ہوا و ہوس میں مبتلا

رہتے ہیں لیکن ایک صاحب فطرت سلیمہ کبھی نہ کبھی ضرور اس غفلت سے چونک پڑتا ہے۔

غرض قاضی سید رضا حسین بھی جلد اس "طلسم مردافگن" اور کرشمۂ ہوش ربا سے چھوٹے اور جلد خواب غفلت سے بیدار ہوگئے، اس کوچہ کو اُنھوں نے اس طرح چھوڑا کہ پھر کبھی قریب نہیں گئے، نفس کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد توبہ کی، اور بیعت کرکے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ جب خدا سے رشتہ جوڑا تو سررشتہ داری سے استعفا دیدیا۔

قاضی صاحب کے سررشتہ داری سے مستعفی ہوکر تائب و مرید ہونے کی صحیح تاریخ ہم کو معلوم نہیں، لیکن اس بنا پر کہ قاضی صاحب نے اپنے پیر و مرشد علیہ الرحمۃ کے ارشاد پر ۸۵-۱۲۸۴ھ مطابق ۶۸-۱۸۶۷ء میں ایک تحریر لکھی تھی جو آیندہ اپنے موقع پر درج ہوگی، یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ان کی بیعت بدرجۂ اقل ۶۷-۱۸۶۶ء میں واقع ہوئی جبکہ اُن کی عمر اکتیس بتیس سال کی تھی اس حساب سے وہ قریبًا ۱۸۵۸ء میں گیا میں ملازم ہوئے اور ۱۸۵۹ء یا ۱۸۶۰ء میں مظفرپور پہنچے غرض اُن کی غیر زاہدانہ اور عیش و نشاط کی زندگی کا دور زیادہ سے زیادہ سات آٹھ برس رہا، اس کے بعد توفیق الٰہی رفیق طریق ہوئی اور فطرت سلیمہ نے صراط مستقیم کی طرف راغب کیا۔

قاضی رضا حسین صاحب نے پٹنہ آکر حافظ قاری مولوی حاجی سید شاہ امیر الحسن صاحب منعمی کے دست مبارک پر توبہ کی اور اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوکر روحانی فیض حاصل کیا، اور جتنا وقت پیر و مرشد کے حضور میں صرف ہوا اس کو حاصل زندگی سمجھا، اور توجہ کے ساتھ کسب ریاضت میں مشغول ہوئے، چونکہ فطرتًا جوشیلی طبیعت لیکر آئے تھے، اس لئے جب اس کوچہ میں آئے تو وہی جوش، وہی شورش، یہاں بھی موجود تھی، بڑی سرگرمی و مستعدی کے ساتھ سرگرم راہ فقر و قناعت ہوئے۔

اب حالت یہ تھی کہ آنا جانا تھا تو بزرگان دین کے عرسوں میں، شرکت تھی تو حال و قال کی صحبتوں میں، باتیں تھیں تو طریقت و معرفت کی، اور ملاقاتیں تھیں تو اصحاب شریعت و صلحا کی، غرض اس راہ میں آکر دنیا بدل گئی، عجیب عالم کیف و سرور تھا، البتہ غم تھا تو عمر رفتہ کا، رنج تھا تو ایام گزشتہ کا، خیال تھا تو اس بات کا کہ تلافی مافات ہو، ذوق تھا تو اس بات کا کہ کوئی رکن، ارکان دین سے فروگزاشت

نہ ہو، چنانچہ اسی عالم میں حج و زیارت کا خیال بے اختیار دل میں آیا، اور سفر حرمین شریفین کا شوق و ولولہ پیدا ہوا، سامان سفر تیار کر کے یہ ارادہ کیا کہ آج رات کو پیر و مرشد سے اجازت لے لیں گے اور کل والدہ ماجدہ سے رخصت ہونے کے لئے سائیں جائیں گے، پھر پٹنہ پہنچ کر ایک دو روز میں اسباب سفر کی تکمیل کر کے روانہ ہو جائیں گے، اس قرار داد کے مطابق احباب وغیرہ کو خطوط روانہ کر دئے، رات کو اپنے پیر کے حضور میں جو پٹنہ محلہ ڈونڈی بازار میں رہتے تھے سفر حج کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوئے، مگر اُنہوں نے اجازت نہیں دی۔ قاضی صاحب کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ حج جیسے نیک کام کی جو بوجہ استطاعت اُن پر فرض بھی ہے کیوں اجازت نہیں دی گئی مگر از راہ ادب خاموش رہے اور یہ خیال کیا کہ چار پانچ دن کے بعد تو اجازت مل ہی جائے گی، اس یقین کے ساتھ دوسرے دن سائیں پہنچے، شب بھر قیام کیا، صبح سب سے رخصت ہو کر ڈومری کے راستہ سے پٹنہ روانہ ہوئے، پالکی میں امام غزالیؒ کی کوئی کتاب دیکھتے جاتے تھے جب ڈومری کے قریب پہنچے، تو سلسلہ مطالعہ میں یہ مضمون نظر آیا کہ دو طرح کے لوگ حج کو جایا کرتے ہیں ایک تو وہ جن کو حاجی کہلانے کی خواہش لے جاتی ہے تو اُن کو ثواب حج سے کوئی بہرہ نہیں، اور دوسرے وہ جن کی خدا پرستی اور تعمیل حکم خداوندی کی سچّی اور خالص نیت راہ بر ہوتی ہے اور جن کو خدا و رسول کی محبت کشاں کشاں لے جاتی ہے، گویا ؎

من نہ باختیار خود میروم از قفائے اُو
ہر دو کمند عنبریں میبرد م کشاں کشاں

حج کا ثواب صرف ایسے ہی با اخلاص لوگوں کا حصّہ ہے، اس مضمون کا پڑھنا تھا کہ کتاب ہاتھ سے رکھدی اور اپنے نفس امارہ کا جائزہ لیا کہ کہیں حاجی کہلانے کی خواہش تو خضر طریق بن کر رہبری نہیں کر رہی ہے، اس احتساب نے حقیقت کھول دی اور بمصداق بل الانسان علی نفسہ بصیرة نفس کی مخفی خواہشیں اور فریب ظاہر ہو گیا، فوراً سفر کا ارادہ ملتوی کیا، چنانچہ ڈومری میں جناب مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے پوچھا کہ ماموں آپ کس دن سفر حج کے لئے روانہ ہوں گے، تو

صاف صاف کہدیا کہ ارادہ ملتوی کردیا' لوگوں کو مشکل یقین آیا' غرض اس دفعہ تو سفر حج ملتوی ہوگیا اگرچہ بعد کو اُنہوں نے دو دفعہ سفر کرکے دو حج کئے مگر کبھی اپنے نام کے ساتھ "حاجی" نہیں لکھا اُن کے احباب میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ قاضی صاحب حاجی بھی ہیں:

تیسرا باب

سرسید سے تعلقات' اور اُن کے متعلق رائے

اس زمانہ میں سرسید کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کا ہر طرف چرچا تھا' اور اُن کے متعلق مخالفانہ موافقانہ خیالات عام طور پر ظاہر کئے جاتے تھے' قاضی صاحب کے بھی سرسید سے تعلقات تھے لیکن یہ سمجھنے کے لئے کہ سرسید احمد خاں صاحب بہادر کا قاضی صاحب پر کتنا اور کیسا اثر تھا' اور دونوں کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت تھی' پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ سرسید کو کیا اور کیسا سمجھتے تھے سرسید کے متعلق اُن کے جو خیالات مجھے مختلف اوقات میں معلوم ہوئے اُن کو مسلسل بیان کے طور پر لکھتا ہوں' جو حسب ذیل ہیں:

سرسید کوئی داعی مذہب' مذہبی واعظ و متعددا ایسے حلقۂ ارادت و بیعت رکھنے والے یا کسی مذہبی منصب مثلاً ولایت' مجددیت' قطبیت' مہدویت یا مسیحیت کے مدعی نہ تھے' اس لئے گو اُن کے عقائد کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُن کی ذات تک محدود تھے' اُن کے متعلق یہ بدگمانی بھی نہیں کی جاسکتی کہ جب کوئی شخص اُن سے ملنے جاتا وہ فوراً اُس کو اپنے عقائد کی تلقین کردیتے'

واقعہ یہ ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء نے مسلمانوں کو تہ و بالا کردیا تھا' سرسید نے بڑے بڑے نامی خاندانوں کو کلیتہً تباہ و برباد ہوتے اور جو باقی رہ گئے تھے اُن کو ذلت و پستی کی حالت میں دیکھا اُنہوں نے روہیلکھنڈ بلکہ تمام صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ اور خصوصاً دہلی کے اعیان و اشراف

کو دفعتہً امارت و ریاست کے مرتبہ سے قعر مذلت و پستی میں گرتے دیکھا، پہلو میں اثر پذیر اور دردمند دل تھا، ان واقعات نے اُن کو بیتاب کر دیا، اس لئے اُن کے غم زدہ دل سے صبح و شام، رات دن، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، غرض ہر وقت ہائے قوم، وائے قوم کی فریاد نکلتی تھی، اور قوم کی صلاح و فلاح کے لئے والہانہ طور پر مصروف رہنا اُن کا بہترین مشغلہ تھا، اس حالت میں جو شخص بھی اُن کے پاس آجاتا تھا، وہ اگر دردمند دل رکھتا ہو تو اُن کے خیالات اور قومی درد سے متاثر ہوتا تھا، سچ ہے ؎

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

انقلاب ۱۸۵۷ء کے اندوہناک واقعات کا اثر بہت لوگوں پر ہوا لیکن کچھ لوگ تو اس داغ کو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے اور کچھ اللہ والوں نے "مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ" کہکر تسلیم و رضا پر عمل کیا چند خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے افسردہ خاطر و مایوس ہوکر حرمین شریفین کی طرف ہجرت کی، جو رہ گئے وہ آخر تک نوحہ و ماتم کرتے رہے اور اپنی زندگی آہ و بکا میں وقف کر دی، یا ناچار طوعاً یا کرہاً دنیا کے کاروبار میں مشغول ہو گئے، لیکن سرسیّد جیسا ذکی الحس اور دردمند دل رکھنے والا شخص کیونکر خاموش بیٹھ سکتا تھا، احساس کے علاوہ قدرت نے عقل و دانش سے بھی حصّہ وافر عطا کیا تھا، یہ حالات دیکھکر سرسید نے خیال کیا کہ گریہ و زاری اور نالہ و فریاد سے کچھ حاصل نہیں ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

بہت سے لوگ قوم کی زبون حالت پر آہ و بکا کرکے چل بسے مگر قوم کو کچھ فائدہ نہ پہنچا، نہ اس برباد شدہ قافلہ کا بکھرا ہوا شیرازہ مجتمع ہوا، وہ دیکھ رہے تھے کہ ابھی تو انقلاب کا روز اول ہے آیندہ آنے والا زمانہ اس سے زیادہ ہولناک ہوگا، اس وقت قوم کو رونے والوں اور سلف کی شان دار داستانوں یا مسلمانوں کی تباہی کی پُر درد کہانیوں کے سُنانے والوں کی ضرورت نہیں لہذا ضرورت ہے کہ اسی قوم میں رہ کر اور عقل و دانش اور ہمت مردانہ سے کام لیکر کچھ کیا جائے، کیونکہ خیر الناس

من ینفع الناس۔

سرسید نے مدت تک ان حالات پر غور کیا اور بدنصیب قوم کے مرض کی تشخیص اور اس کے اسباب و علامات کے تجسس و تفحص میں مصروف رہے' اس کے بعد طریقۂ علاج پر غور کیا' پھر علاج یعنی عمل کا نمبر آیا۔

سرسید کے نہ تھکنے والے دماغ نہ مایوس ہونے والی طبیعت کو سکون و خاموشی سے کیا واسطہ تھا' انہوں نے عزم راسخ اور ہمت مردانہ سے کام شروع کیا' اور اس طرح کہ ہمہ تن اسی میں مصروف ہو گئے' انہوں نے اپنی زبردست شخصیت سے دوسروں کو بھی متاثر کیا' ان کے پاس جو آیا اسی رنگت میں رنگ گیا' اور قومی کام میں دل و جان سے ان کا شریک ہو گیا۔ سرسید اپنے عقائد کی تو کسی کو تعلیم نہیں دیتے تھے لیکن اپنی تعلیمی تحریک میں ہر شخص کو شریک کرنے کی کوشش کرتے تھے' ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ وہ شخص مقلد ہے یا غیر مقلد' سنی ہے یا شیعہ' خارجی ہے یا ناصبی بس یہ کافی تھا کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے' مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے' اور ان کا غم خوار و غمگسار ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کے مرض کا اصلی علاج مغربی تعلیم کا ماءالجبن تجویز کیا' مگر اس شرط پر کہ یہ خود مسلمانوں کی نگرانی و اہتمام سے نہ کہ دین و ایمان کے رہزنوں (مشنریوں) یا مذہب سے کام نہ رکھنے والوں کے انتظام سے دیا جائے۔

مگر چونکہ قوم اصلی مرض جہل و نادانی کے علاوہ سخت یرقانی تپ میں مبتلا تھی' اور چیزوں کو اس کے اصلی مزہ اور رنگ میں چکھنے اور دیکھنے سے قاصر' اس لئے ضرور تھا کہ اصلی علاج کے موثر بنانے کے لئے اس کی دوا' غذا' اور پرہیز کی تدبیریں کی جائیں' غرض ایک طرف تو یہ خیال تھا اور دوسری طرف اس ناگزیر علاج ماءالجبن کی حالت میں الحاد و دہریت کی مضر صحت ہوا لگ جانے کا قوی اندیشہ تھا' اس لئے اول الذکر کے دفعیہ اور آخر الذکر کے حفظ ما تقدم کی نیت اور مسلمانوں کے ملکی و سیاسی اغراض کے لئے انہوں نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ سے مذہبی

مسائل میں پڑنا ضروری سمجھا۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے ایسے مسائل جن کو درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہ تھا، اور محض لوگوں کے اوہام باطلہ سے تعلق رکھتے تھے اور قومی ترقی کے مانع تھے، نیز وہ مسائل جو دشمنان اسلام نے فرمانروایانِ وقت کو بدظن کر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اسلام کی طرف منسوب کر دئے تھے، اور کچھ ایسے مسائل جو اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یورپ کے ملحدین و معترضین نے اسلام کے سر تھوپ دئے تھے، سرسید نے بڑی قابلیت و کامیابی سے ان مسائل کو حل کیا اور اُن کے جوابات دئے۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ متعدد مسائل خصوصاً قرآن مجید کی تاویل میں سرسید سے لغزشیں ہوئیں اور بہت سے مقامات پر صریح غلطیاں سرزد ہوئیں، جس سے نہ صرف سرسید کے حاسدوں اور دشمنوں کو نکتہ چینی کا موقع ملا، بلکہ نیک نیت اور مخلص علمائے دین نے بھی ان اغلاط و تاویلات کی بنیاد پر سرسید جیسے غم خوار و جاں نثار قوم کو نیچری، دشمن اسلام، بلکہ کافر قرار دیا، اور ان خیالات کو شہرت دی کہ سرسید کو مذہب اسلام سے کچھ سروکار نہیں ہے، وہ خود اور اُن کے احباب و حلیف و معاون بیدین ہیں، وہ بظاہر مسلمانوں کے خیرخواہ، اور درحقیقت دشمن و بدخواہ ہیں جو اُن سے تعلقات رکھے گا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیگا۔

قاضی سیّد رضا حسین کہا کرتے تھے کہ میں سرسید کو گریٹ مین (نامور) بلند خیال اور مسلمانوں کا خیرخواہ اور پشت پناہ سمجھتا ہوں، وہ مسلمانوں کے بہی خواہ اور اسلام کے جاں نثار ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں وہ واقعی مسلمانوں کے لئے مفید ہے، لہذا مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ دنیوی امور میں سرسید کو اپنا مخلص و ہم خیال کریں۔

قاضی صاحب کی رائے تھی کہ سرسیّد اعلیٰ درجہ کے شریف النفس، پاک طینت، نیک نیت، اور صاحب اوصاف حمیدہ شخص ہیں، اور میں کسی طمع اور غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ محض خلوص اور اسلامی بہی خواہی کی وجہ سے دوست رکھتا اور اُن کی عظمت کرتا ہوں۔

وہ فرماتے تھے کہ میں بہت سے مسائل خصوصاً اعتقادیات میں سرسید کا ہم خیال نہیں ہوں میں دوزخ، جنت و ملائکہ کو اسی طرح مانتا ہوں، جس طرح صراحتہً قرآن مجید سے سمجھا جاتا ہے، مگر سرسید کو کافر نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اگرچہ اُن سے غلطیاں ضرور ہوئیں لیکن نیک نیتی اور اسلام کے تحفظ کے خیال سے ہوئیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی عقل و ہوش والا انسان یہ کرسکتا ہے کہ جان بوجھ کر اپنے ہاتھوں دوزخ خریدے، اور اپنی عاقبت خراب کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سرسید مذہبی مسائل و اعتقادیات میں مداخلت نہ کرتے اور قرآن مجید کی دور از کار تاویلات میں نہ پڑتے تو اُن کی اس قدر مخالفت نہ ہوتی، بلکہ اُن کو مسلمانوں کی طرف سے زیادہ مدد ملتی، اس کا احساس سرسید کو بھی ہوا، چنانچہ ایک خاصی مدت تک انہوں نے تہذیب الاخلاق کو بند رکھا، اور جب دوبارہ لوگوں کے اصرار سے جاری کیا تو مضامین کا رنگ بدلا ہوا تھا۔

قاضی صاحب اگرچہ مذہبی مسائل میں سرسید کے ہم آہنگ نہیں تھے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا وہ محض سرسید کی مفید خدمات کی وجہ سے اُن کو مانتے اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، لیکن عام لوگوں کو ان تفصیلات کا علم نہ تھا، اس لئے پٹنہ میں جب اس کا بہت چرچا ہوا کہ قاضی صاحب نیچری اور بالکل سید احمد خاں کے پیرو بن گئے تو مولوی امین اللہ صاحب مرحوم نے جو قاضی صاحب کے پیرزادے اور بہت ہی پاک طینت، نیک مزاج اور قاضی صاحب کے مخلص تھے، بمعیت میر احمد حسین صاحب رئیس پٹنہ جو قاضی صاحب کے پیر بھائی تھے ۸۰-۱۸۷۹ء میں ایک کمیٹی بنائی، جس کا مقصد یہ تھا کہ قاضی صاحب کے عقائد و خیالات کی اصلاح کی جائے، اس انجمن یا کمیٹی کے سرگرم کارکن اور نفس ناطقہ مولوی حکیم عبدالحمید صاحب تھے۔ اور ان تین بزرگوں کے علاوہ اور ذی علم و صاحب اقتدار لوگ بھی اس میں شریک تھے، جب ان لوگوں نے قاضی صاحب سے گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ میں اصل عقائد میں ہرگز سید صاحب کا ہم خیال نہیں ہوں اور نہ اُن تاویلات کو مانتا ہوں جو سرسید نے قرآن مجید کی آیات کے متعلق کی ہیں، ہاں بہت سی وہ باتیں جو عقائد میں داخل نہیں ہیں، بلکہ محض توہمات ہیں اور محض زمانہ دراز کی عادت کی وجہ سے لوگوں نے ان کو

اسلام کے لوازم میں سمجھ لیا ہے، اگر سید احمد خاں نے ان کا ابطال کیا ہے، تو ان باتوں کو میں بیشک نہیں مانتا، جیسے جادو یا کسی مخصوص لباس کا اسلامی ہونا، یا وہ رسم و رواج جس کو لوگ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کو اسلام سے تعلق نہیں، انھوں نے کہا کہ میں تہذیب الاخلاق کے وہ پرچے پیش کرتا ہوں جن میں اس قسم کے مضامین ہیں، آپ لوگ ان کے تشفی بخش جواب دیں، میں نہایت خوشی سے قبول کر لوں گا، مگر تحقیقات و مباحثہ کی نوبت نہ آئی اور یہ کمیٹی چھ سات مہینے تک قائم رہ کر بغیر کسی مفید نتیجہ کے ختم ہو گئی۔

غرض قاضی صاحب سرسید کو مسلمانوں کا بہی خواہ اور لیڈر مانتے تھے، اور بہت سے عمدہ اوصاف کی بنا پر اُن کی عزت کرتے تھے، لیکن سرسید کے مذہبی مسائل کے متعلق اُن کا یہ رویہ تھا کہ بعض مسائل کو حق سمجھتے تھے اور بعض کے مخالف تھے، لیکن اُن کی مخالفت و موافقت ایمان داری پر مبنی تھی، جائز طریقہ پر اختلاف کرنے کو وہ بُرا نہیں سمجھتے تھے، البتہ جو اختلاف حسد و کینہ پر مبنی ہو اُس سے نفرت کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ سید احمد خاں بہادر کے مخالف دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو علما اور اُن کے پیرو جو قرآن مجید کی بیجا تاویلات اور دین کے بعض مسلّمہ مسائل کی تردید کی وجہ سے سرسید کے مخالف ہیں، یہ گروہ جو کہتا اور لکھتا ہے وہ باعتبار اکثر نیک نیتی اور دین کی حمایت و تائید کے خیال سے ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو خود علم سے بے بہرہ ہے، محرّمات و منہیات کا مرتکب، سراپا دنیا میں منہمک، سر سے پاؤں تک انگریزی میں ڈوبا ہوا، انگریزوں کی تقلید کو دین و ایمان سمجھنے والا اور قوم کا نام بیچ کر ذاتی اغراض حاصل کرنے والا، بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں کی خوشامد سے قوم کو دیدہ و دانستہ ضرر پہنچانے والا، اس قسم کے لوگوں کی مخالفت کو وہ سراسر حسد و بد نفسی پر مبنی سمجھتے تھے۔

اس قسم کی مخالفت یا حسد کا وہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ جس زمانہ میں سرسید احمد خاں بہادر سپریم کونسل کی ممبری کی حیثیت سے کلکتہ میں تھے آخر الذکر گروہ کے ایک شخص نے اخوت اسلامی یا مہمان نوازی کے خیال سے نہیں بلکہ محض اپنی دناءت نفس کی بنیاد پر سرسید کو اپنے یہاں رات کے

کھانے پر مدعو کیا، یہ میزبان عموماً انگریزوں کے یہاں شریک ہوتے اور چھری کانٹا استعمال کرتے تھے، اس کے علاوہ سید صاحب کے طرز معاشرت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ کوٹ، پتلون پہنتے اور انگریزی وضع میں رہتے ہیں، مگر اُس روز اپنے یہاں بالکل ہندوستانی طریقہ پر نشست کا انتظام کیا، اور جو کرسیاں موجود تھیں اُن کو اٹھوا دیا، سید صاحب کسی خدمت گار کو ساتھ نہیں لے گئے تھے، اس لئے پہلی مصیبت اُن کو اپنے ہاتھ سے بوٹ اُتارنے کی پڑی، دعوت کی یہ صورت تھی کہ چمچہ جو ہندوستانی کھانوں کے لئے بھی بہت ضروری ہے ایک بھی موجود نہ تھا، یہ طریق عمل اختیار کر کے اُنھوں نے اپنے خیال میں سید صاحب کو ذلیل کیا، حالانکہ اس طریقہ سے اُنھوں نے خود اپنی نالائقی ثابت کی۔

قاضی رضا حسین صاحب کہا کرتے تھے کہ میں بہت سے مسائل و معتقدات میں سید صاحب کا پورا مخالف ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ جس ایمانداری کے ساتھ میں اُن کا مخالف ہوں، اسی ایمانداری کے ساتھ وہ علماء سابق کی رائے کے مخالف تھے، اختلاف رائے اور چیز ہے اور بغض و عداوت اور چیز، اس کی تمثیل میں یہ نقل بھی بیان کرتے تھے کہ ایک مجذوب اپنی بڑ میں اللہ میاں کو گالیاں دیا کرتا تھا بعض اور بچوں نے بھی اس کے سامنے خدا کو گالیاں سنائیں، مجذوب نے آگ بگولہ ہو کر پتھروں سے اُن کی خبر لی اور کہنے لگا بدمعاش! ہم تو یہ باتیں پیار سے کہتے ہیں تم کس منہ سے کہتے ہو، اور ہماری ریس کرتے ہو۔

جب میں پہلی دفعہ قاضی صاحب سے ملا اُس زمانہ میں سرسید احمد خاں بہادر کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا تھا، اس کی وجہ ظاہر تھی کہ اُسوقت تک میں علماء اور عربی خواں طلبہ کی ہی صحبت میں رہا کرتا تھا، اور برابر اخبار نور الآفاق اور نور الانوار مطالعہ کیا کرتا تھا، جب قاضی صاحب سے ربط بڑھا میں اپنے اسی خیال پر راسخ تھا، جب تہذیب الاخلاق میں کوئی چیز چھپتی تو قاضی صاحب مجکو اور اپنے مرشد زادے مولانا امین اللہ صاحب کو سناتے اور جب اس کا جواب نور الآفاق یا نور الانوار میں چھپتا تو میں اُن کو سناتا، اس کے بعد تہذیب الاخلاق کے مضامین پر اپنی سمجھ کے موافق

میں بھی برجستہ اعتراض کیا کرتا، قاضی صاحب یہ اعتراضات ٹھنڈے دل سے سنتے اور اس پر گفتگو کرتے، کبھی یہ اعتراضات ان کی بزرگانہ عنایات میں سدِّراہ نہ ہوتے، یہاں تک کہ قاضی صاحب نے مجھے انگریزی پڑھنے علی گڑھ بھیجا، ڈیڑھ برس بعد جب میں واپس آیا، اور قاضی صاحب کے پاس ٹھیرا، تو ایک دن شب کے وقت تخلیہ میں پوچھا کہ کیا اب تک آپ سرسید کو کافر سمجھتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میرا اب تک وہی خیال ہے جو تھا، مگر قاضی صاحب کی تہذیب و شائستگی یہ تھی کہ سنکر صرف یہ فرمایا کہ "میں اُن کو کافر نہیں سمجھتا" اور اس کے بعد اسی طرح بشاشت سے گفتگو فرماتے رہے۔

اس موقع پر ناظرین کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے کچھ دنوں کے بعد مجھے کثرت سے اس کے دلائل ملے کہ سید صاحب کی طرف کفر کا انتساب غلطی ہی نہیں بلکہ صریح ظلم ہے۔

وَاللّٰہ لایحب الظالمین

چوتھا باب

پبلک لائف، رفاہ عام کی خدمات

ملازمت سے دست بردار ہونے کے بعد قاضی صاحب نے ایک زمانہ تک عزلت نشینی کے ساتھ زندگی بسر کی، اگرچہ وہ تارک الدنیا فقرار کی طرح دنیا کو چھوڑ کر خلوت نشین تو نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اپنے خانگی معاملات اور جائداد کو اچھی طرح دیکھتے انتظام کرتے اور احباب سے ملتے تھے، لیکن پُرانے طرز کے ہندوستانی امراء کی طرح ملکی سیاست اور گورنمنٹ کے اچھے بُرے معاملات اور پالیسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے انکو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، بلکہ ان باتوں میں پڑنے کو وہ اسباب نخوت و غرور میں سے سمجھتے تھے، وہ نہ کبھی حکام ضلع سے ملتے نہ عام کمیٹیوں اور جلسوں میں شرکت کرتے، نہ کسی فنڈ میں چندہ دیتے، نہ ان کاموں میں کوئی اصلی و واقعی خوبی سمجھتے تھے، مگر بنیاد

کی آمد و رفت میں جب سیّد احمد خاں بہادر سے جو وہاں سب جج تھے چند ملاقاتیں ہوئیں اور مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر خوب خوب باتیں ہوئیں تو سیّد صاحب نے اُن سے سوال کیا کہ کیا آپ رات دن ذکر و شغل ہی میں مصروف رہتے ہیں، قاضی صاحب نے کہا نہیں! کچھ وقت لوگوں سے ملنے ملانے اور گپ شپ میں بھی صرف ہوتا ہے، اس پر سید صاحب نے فرمایا کہ جو وقت آپ کا اوراد و وظائف سے بچتا ہے اس کو پبلک کاموں میں صرف کیجئے، یہ بھی خدا کی عبادت ہی ہے، خیر الناس من ینفع الناس۔ غرض سرسید کے اثر و صحبت نے قاضی صاحب کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اور بہت سے دوسرے مشاہیر کی طرح وہ بھی سیّد صاحب سے مسحور ہو گئے ؎

مجروح ایک بندۂ درگاہ ہی نہیں
گھائل تری نظر کا بطرز دگر ہر ایک

اب وہ سمجھے کہ انما الاعمال بالنیات یعنی اعمال نیتوں پر منحصر ہیں، اور یہ کہ لکل امرء ما نوی ہر شخص کو اپنی نیت کا پھل ملتا ہے، اُنھوں نے یہ خیال کیا کہ اور لوگ خواہ کسی نیت سے یہ کام کرتے ہوں، مگر میں محض مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لئے پبلک خدمات انجام دوں گا، اور ان سے کوئی ذاتی مقصد حب جاہ یا حصول خطاب وغیرہ مدنظر نہ رکھوں گا، کیا بعید ہے کہ اس نیت کے ساتھ خدا تعالیٰ مجھے اجر عطا کرے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

اس بیکاری اور بے سود زندگی سے جس کا نام میرے فریب نفس نے عزلت نشینی رکھا ہے، یہ پبلک لائف ہزار درجہ بہتر ہے، بشرطیکہ نیت اچھی ہو، کھانے اور سونے کے علاوہ جس قدر وقت بچتا ہے وہ سب تو کیا، اس کا اکثر حصّہ بھی تو خدا کی عبادت میں صرف نہیں ہوتا، بلکہ محض زق زق بق بق میں گزر جاتا ہے نہ دنیا کا فائدہ نہ دین کا۔

قاضی صاحب طبعاً صداقت پسند و پُرجوش تھے، اس خیال کا آنا تھا کہ

تَرَکتُ اللّات والعُزّیٰ جمیعًا (یعنی میں نے لات وعزیٰ سب کو چھوڑ دیا' اور دانا آدمی
کذالکَ یفعل الرجل البصیر ایسا ہی کیا کرتا ہے)
کہ کر پبلک لائف میں داخل ہو گئے' اور جب ایک دفعہ اس لائف میں داخل ہو گئے تو آخر عمر
تک استقلال سے مصروف خدمت رہے'

دولتمند' ذی علم اور خاندانی رئیس تو تھے ہی لہذا اس زمانہ کے دستور اور طریقۂ کار کے
مطابق کلکٹر اور کمشنر وغیرہ حکام سے ملنے جلنے لگے' ان میں روز ازل سے یہ خوبی (کشش) ودیعت
رکھی گئی تھی کہ جو ان سے ملا وہ ان کا گرویدہ ہو گیا' چنانچہ کلکٹر ٹھٹہ نے ان سے متاثر ہو کر سفارش
کی اور گورنمنٹ نے ان کو میونسپل کمشنر مقرر کیا' قاضی صاحب ایک خاص اصول کے شخص تھے لہذا ان
کی فطرت نیز جس مقصد سے انہوں نے پبلک زندگی اختیار کی تھی وہ اس کو مقتضی تھی کہ وہ جو کام
بھی کریں اس کو دیانت' امانت' اور پوری قابلیت سے انجام دیں' اس بنا پر انہوں نے سب
سے پہلا کام یہ کیا کہ جب اس تقرر کی اطلاع ہوئی' تو میونسپل ایکٹ پوری توجہ سے پڑھا اور اس پر
عبور حاصل کر لیا' یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پہلے پہل وہ جس اجلاس میں شریک ہوئے اور جس کے پریسیڈنٹ
کلکٹر ضلع تھے' اس میں چند معمولی کاموں کے علاوہ ایک غیر معمولی اور اہم معاملہ بھی پیش ہونے والا تھا
جو یہ تھا کہ میونسپلٹی کے یورپین وائس چیرمین کو جو اپنے عہدہ سے استعفا دیکر کسی دوسری جگہ جانے تھے
میونسلپٹی سے ایک معقول رقم بطور انعام دی جائے۔

صاحب کلکٹر کے آنے پر جب کارروائی شروع ہوئی تو پرانے ممبروں نے جیسا کہ دستور تھا
اپنی اپنی پارٹی والوں کے نام چھوٹے چھوٹے پرچے دست بدست دوڑا دیئے'
ایک پرچہ قاضی صاحب کو بھی ملا۔ غرض حسب ضابطہ ایک ممبر نے تحریک' اور دوسرے نے تائید کی
اس کے بعد تکمیل ضابطہ کے لئے ووٹ لیا جانے لگا' تو ہر ایک ممبر نے "جو حکم" کے اصول پر ووٹ
دینا شروع کیا۔ جب قاضی صاحب کی باری آئی تو انہوں نے اس تحریک سے اختلاف کیا' اس زمانہ
استبداد میں اس قسم کی اخلاقی جرأت کی مثال کہاں مل سکتی تھی' کلکٹر اور تمام ممبروں پر حیرت کا عالم

کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، غالباً میونسپلٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ "کلکٹر کی رائے" سے
جس کے متعلق اِشَارَتہٗ حُکمُہٗ وحُکمہٗ غَنَمۃ، یعنی اس کا اشارہ حکم ہے اور اُس کا حکم غنیمت،
پورے طور پر صادق آتا تھا، مخالفت کی جائے۔

بہرحال جب حیرت و استعجاب کی کیفیت کچھ زائل ہوئی تو صاحب کلکٹر نے اُن سے
مخالفت کی وجہ پوچھی، اُنہوں نے متانت و سنجیدگی سے جواب دیا کہ میونسپلٹی کے قانون میں مصارف
کی جو مدیں درج ہیں اُن میں یہ انعام کسی مد میں درج نہیں، اور ممبروں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے
کہ وہ کسی ایسی رقم کے خرچ کرنے کی منظوری دیں جو ان مدوں کے اندر داخل نہ ہو۔

اگرچہ یہ رائے معقول اور عین مطابق قانون تھی مگر کلکٹر کے اثر کی وجہ سے کوئی شخص قاضی
صاحب کا ہمنوا نہ تھا، اس لئے کثرت رائے سے انعام کے حق میں فیصلہ ہوا، لیکن چونکہ یہ رائے مع
وجوہ کارروائی میں قلمبند کر لی گئی تھی لہذا جب یہ پوری کارروائی بغرض منظوری گورنمنٹ بنگال
کے پاس بھیجی گئی تو انعام دینے کی تحریک نامنظور ہوئی یعنی تنہا قاضی صاحب کی رائے کے مطابق
فیصلہ ہوا۔

اس کے بعد مقامی افسروں اور حکام کلکتہ سے ان کی جس قدر واقفیت و شناسائی بڑھتی
گئی اسی قدر قاضی صاحب کی وقعت و عزت اُن کے دلوں میں بڑھتی گئی، چنانچہ جب تک نامزدگی
سے انتخاب کا قاعدہ جاری رہا، برابر سرکار اُن کو نامزد کرتی رہی، اس کے بعد جب لوکل سیلف
گورنمنٹ کے اصول پر انتخاب کا قاعدہ جاری ہوا تو ہمیشہ مسلمان اور ہندو دونوں بغیر کسی اندرونی
سعی و تحریک کے اپنی رضامندی و خوشی سے ان کو ووٹ دیتے رہے، اسی انتخاب کے ذریعہ
سے وہ لوکل بورڈ کے ممبر بھی ہوئے، نیز حکام نے اپنی مردم شناسی سے ان کو سنگل (منفرد) بنچ کا
آنریری مجسٹریٹ مقرر کر کے درجہ دوم کے اختیارات عطا کئے، اور قاضی صاحب آخر زمانہ تک
علاوہ دیانت، انصاف اور بے غرضی کے اپنے فرائض ایسی محنت، سرگرمی، مستعدی و چستی سے
انجام دیتے رہے کہ کوئی تنخواہ پانے والا ملازم بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا، اگر کبھی کسی تحقیقات

یا زمین کے معائنہ کا حکم آیا تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے اور اس کو انجام دیا' سالہا سال کا مشاہدہ ہے کہ اُنہوں نے کبھی کسی کام کو طاق نسیاں پر نہیں رکھا' اور نہ اپنا کام کسی دوسرے شخص پر ٹالا' بلکہ جو احکام آئے خود اُن کی تعمیل کی' رپورٹ لکھی اور بھیجدی' اس فرض شناسی اور محنت کی وجہ سے حکام و رعایا دونوں اُن کے گرویدہ تھے اور اُن پر اعتماد رکھتے تھے' اور پبلک کاموں میں اپنے بے لوث طرز عمل کی وجہ سے وہ ہندو' مسلمانوں اور انگریزوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھے۔

چنانچہ ہیورج صاحب سول و سشن جج پٹنہ' ایف ام ہلیپڈے صاحب کمشنر پٹنہ' کوٹین صاحب مجسٹریٹ و کلکٹر' گریرسن صاحب جوائنٹ مجسٹریٹ و کلکٹر' سامن صاحب انجنیر پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ وغیرہ قاضی صاحب کے بڑے دوست' اور اُن کی سچّی قدر و منزلت کرنے والے تھے' ہیورج صاحب نے پٹنہ سے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی برابر اُن سے مراسلت جاری رکھی' اور اسی طرح گریرسن صاحب نے بھی یہاں تک کہ جب وہ رخصت پر ولایت گئے تو وہاں سے اور براعظم یورپ کے بعض مقامات سے جہاں وہ سیر و سیاحت کے لئے گئے تھے برابر قاضی صاحب کو خطوط لکھتے رہے' جب وہ پٹنہ میں تھے تو پہلی ہی ملاقات میں اُنہوں نے قاضی صاحب کو اپنی لیڈی سے ملایا' اور ہمیشہ اُن سے مخلصانہ تعلقات رکھے' پٹنہ سے جانے کے بعد ان کے جو خطوط آتے تھے اس میں مسز گریرسن کا سلام ضرور ہوتا تھا۔

گریرسن صاحب نے صوبۂ بہار کی زبان اور رسوم پر جو کتاب گورنمنٹ بنگال کی فرمائش سے لکھی ہے' اُس میں جو کچھ مسلمانوں کے رسوم کے متعلق ہے وہ سب قاضی صاحب کا دیا ہوا ہے' چنانچہ مسٹر گریرسن نے اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے۔

رفاہ عام کے کام

اُس زمانہ میں جب میں کرانیکل کی اڈیٹری کی خدمت انجام دیتا تھا' ایک روز قاضی صاحب سے عرض کیا کہ مسلمانوں پر اب تک بڑا دھبہ یہ ہے جو ہندو کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اول تو مسلمانوں میں ایم اے بہت کم ہیں' اور جو ہیں بھی تو وہ

صرف فارسی و عربی کے ایم اے ہیں جو اُن کو عموماً بچپن سے سکھائی جاتی ہے اس لحاظ سے گویا وہ اُن کے گھر کی زبانیں ہیں، تاریخ و جغرافیہ میں صرف ایک مسٹر امیر علی صاحب نے ایم اے کیا ہے لیکن انگلش اور ریاضی میں کوئی بھی ایم اے نہیں، جیسا کہ ہندو کہتے ہیں اس کا یہ سبب نہیں کہ مسلمانوں کو ریاضی کے ساتھ مناسبت نہیں، یا ان کو انگلش جیسی چاہئے نہیں آسکتی، یہ محض غلط اور بے بنیاد الزام ہے، بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہو کہ اس وقت تک انگریزی پڑھنے والے زیادہ تر وہ ہیں جو متوسط یا کم استطاعت طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ہر کھپ کر بی اے تک پہنچتے ہیں، اس کے بعد نہ تو ان کو کوئی تعلیمی وظیفہ ملتا ہو نہ اور کسی طریقہ سے مدد ملتی ہے، پھر یہ بیچارے اگر بی اے پاس کرکے نوکری نہ تلاش کریں تو کیا کریں، جنکو نوکری نہیں ملتی وہ پرائیویٹ ٹیوشن کرکے بی ایل کا لکچر سنتے اور وکیل ہوتے ہیں، ان غریبوں کو اس کا موقع ہی کب ملتا ہے کہ وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر ایم اے پاس کرنے کا حوصلہ نکالیں۔

قاضی صاحب نے فرمایا پھر کیا کرنا چاہئے؟ میں نے عرض کیا کہ ایسے ہونہار و باہمت طلبہ کی اعانت کی جائے اور جو دشواریاں اُن کے لئے سنگ راہ ہیں وہ دور کی جائیں تاکہ وہ ریاضی یا انگلش میں اطمینان سے ایم اے کرسکیں۔

قاضی صاحب نے یہ رائے بہت پسند کی اور فرمایا کہ زیادہ گنجائش تو نہیں ہے البتہ میں اس مقصد کے لئے ہر سال ایک ایسے طالب علم کو وظیفہ دے سکتا ہوں جو اپنے کو اس کا اہل ثابت کرے، چنانچہ پچیس روپیہ ماہانہ وظیفہ اور اسکے علاوہ ایک معتدبہ رقم کتابوں کے لیے ایک لڑکے کو دینا قبول کیا، اور برابر دیتے رہے، طلبہ اس وظیفہ سے مستفید ہوتے رہے کوئی ریاضی میں ایم اے ہوا، کوئی انگلش میں، چنانچہ مولوی غلام حیدر خاں صاحب ریاضی میں ایم اے ہوئے

نفع رسانی خلق اُن کے نزدیک دینی عبادت اور دنیوی خدمت کا نصب العین ہو گیا تھا۔

ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے اور ان کو اپنی زیست سے ناامیدی ہوئی، اُن کے ایک عزیز اُن کے پاس آبیٹھے، قاضی صاحب اُس وقت کسی خیال میں منہمک تھے اور اُن کی آنکھیں اشک آلود تھیں

اسی حالت میں اُنہوں نے فرمایا میرا وقت آخر ہوا، میں جو ڈوب کر دیکھتا ہوں تو اپنے دل کو ہر سب طرح کی آلائشوں اور تعلقات سے پاک پاتا ہوں، کوئی حسرت و تمنا دل میں نہیں ہے، ہاں ایک کانٹا ہے، جو برابر کھٹک رہا ہے وہ یہ کہ قوم کے لئے ہم نے کیا کیا؟ جو کر سکتا تھا وہ نہ کر سکا۔

خدا کی شان ہے کہ اس مرض سے اُنھیں صحت حاصل ہوئی، صحت پاکر پہلا کام جو اُنہوں نے کیا وہ اپنی جائداد کا تعلیم کے لئے وقف کرنا تھا، خیر اپنی جائداد تو وقف کی اس کے علاوہ بیوی کو بھی اس کے لئے وصیت کر گئے، چنانچہ قاضی صاحب کے بعد انہوں نے بھی اپنی جائداد کا ایک بڑا حصّہ وقف کر دیا، یہ دونوں وقف اب تک موجود ہیں اور کم استطاعت مسلمان طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ گویا صدقہ جاریہ ہے، جو لوگ اس امداد کی بدولت علم حاصل کرکے اپنی ذات کو یا بیوی بچّوں اور خاندان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اس کا ثواب خود بخود قاضی صاحب کو پہنچتا ہے، اور جب تک یہ سلسلہ جاری ہے انشاء اللہ پہنچتا رہیگا۔

قاضی صاحب مسلمانوں کے ہر قسم کے اسکول اور تعلیم گاہ میں بلکہ ہر اس کام میں جو مسلمانوں کی صلاح، فلاح اور ترقی کے لئے کیا جائے خود بھی چندہ دیتے تھے اور اپنے احباب سے بھی دلواتے تھے، مثلاً ہر وے، ڈاکٹری، آرٹ اسکول، وغیرہ کے کم استطاعت طلبہ کو تعلیمی وظیفہ دیتے تھے، اس کے علاوہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی قریباً ہر مد میں اُنہوں نے چندہ دیا، جیسے حاطہ کی جالیاں، تعمیر بورڈنگ ہاؤس، اسٹریچی ہال، چاہ اخوان الصفا، سب میں اُن کا ذاتی حصّہ ہے۔ اور ان میں سے بعض تعمیرات پر اُن کا نام بھی کندہ ہے، تعلیمی اعانت کے معاملہ میں وہ فراخ دلی و بے تعصبی سے کام لیتے تھے، سنی، شیعہ، مقلد، یا غیر مقلد کی تفریق نہ تھی سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، اور سب کی ترقی سے بلا امتیاز یکساں خوش ہوتے اور سب کی بربادی و مصیبت پر آنسو بہاتے تھے۔

ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ قاضی صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ باوجود انگریزی تعلیم کے حامی ہونے کے عربی کے مدارس میں بھی چندہ دیتے ہیں؟ فرمایا دونوں ہی کی ضرورت ہے اگر علوم جدیدہ حاصل کرنے کے لئے جن سے قوم کی بگڑی ہوئی حالت درست ہو انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے

تو دین کیلئے جس سے عاقبت درست ہو اور نجات اخروی حاصل ہو عربی کی ضرورت ہے چونکہ دنیا ہر شخص کو مرغوب ہے اور اسکا نتیجہ بھی عاجل اس لئے انگریزی تعلیم کے لئے صرف تحریک کی ضرورت ہے لوگ خود بخود ادھر جھک پڑیں گے' اور ایک کی کامیابی دوسروں کو ترغیب دینے والی اور متوجہ کرنے والی ہوگی' لیکن عربی تعلیم ایک تو گئی گزری ہو رہی ہے' اور انگریزی کے مقابلہ میں اس کو زوال و انحطاط ہے' لہذا عربی تعلیم کی اعانت کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے اور بڑھتی جائے گی' جو لوگ آج انگریزی تعلیم کی اشاعت و ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں اگرچہ ان کی کوشش بالکل صحیح ہے مگر ایک دن ان کو عربی تعلیم کی حمایت پر بھی جھکنا پڑیگا' ورنہ دین کا محض نام رہ جائے گا' اس لئے میں دونوں کی اعانت اپنے اوپر واجب سمجھتا ہوں' تاکہ مسلمان خسرالدنیا والآخرۃ کا مصداق نہ بنیں۔

قومی مقاصد میں سرگرمی اور دوسروں کو ترغیب

جب سے قاضی صاحب پبلک لائف میں داخل ہوئے' جس کام کو انہوں نے دیانتاً مفید سمجھا' اور ملک و قوم کے لئے بہتر جانا اس میں نہ صرف خود ہی شریک ہوئے اور مالی اعانت کی بلکہ اپنے اعزہ و احباب' اور شہر کے امراء و سربرآوردہ لوگوں کو بھی اس کے مالہٗ و ماعلیہ سے آگاہ کیا اور دلنشین طریقہ سے اس کے فائدے سمجھا کر شریک و ہمدرد بنایا'

مثلاً جنگ روم و روس میں ترکوں کے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی اعانت کا معاملہ۔ میں نے بچشم خود ان کو ۱۸۷۷ء و ۱۸۷۸ء میں پہلے پہل مسلمان شہداء کی بیوہ عورتوں اور بچوں کی اعانت کے لئے چندہ جمع کرنے میں بہت سخت کوشش کرتے دیکھا' خود انہوں نے اور ان کے اقارب و احباب نے توبے تامل چندہ دیا' مگر انہوں نے دیکھا کہ چند اعلیٰ درجہ کے سنی امراء اور سب شیعہ محض غلط اوہام کی بناء پر چندہ نہیں دیتے تو اس سے ان کے دل کو دوہرا رنج پہنچا' ایک تو اس وجہ سے کہ ایسے ضروری مقصد میں چندہ نہ دینا انسانی و اسلامی ہمدردی کے خلاف ہے' دوسرے ایسے معاملہ میں شیعہ سنی کا اختلاف اور پھوٹ' مسلمانوں کے تنزل اور بدنصیبی کی علامت ہے' اس حالت کا احساس کر کے انہوں نے سب سے پہلے سربرآوردہ سنی مسلمانوں کو

سمجھانے کے لئے بانکے پور میں ایک خاص کمیٹی منعقد کی، اس میں ان سب اصحاب کو بلایا اور سمجھایا، اور با اقتدار و ذی اثر لوگوں کے ذریعہ سے اُن کے شکوک رفع کرائے اور آخر کار اسی ایک جلسہ میں ان صاحبوں سے تین ہزار روپیہ سے زیادہ ترکوں کو اعانت کے لئے لکھوایا، غرض سُنّیوں کا معاملہ تو طے ہو گیا اب شیعہ اصحاب کو اس کار خیر کی طرف متوجہ کرنا باقی تھا، مگر اُن کو ہموار کرنا آسان نہ تھا، وہ من حیث الفرقہ اس چندہ سے بالکل الگ تھے، اُن کا خیال تھا کہ جب شاہ کجکلاہ ایران، ترکوں کی مدد سے بالکل کنارہ کش اور غیر جانبدار ہیں، تو ہمارا اس چندہ میں شریک ہونا قومی مصلحت کے خلاف ہے، مگر قاضی صاحب کی یہ آرزو تھی کہ کسی طرح یہ اختلاف دور ہو، اور ایسے نازک موقع پر مسلمان فرقہ وارانہ جھگڑوں میں مبتلا نہ ہوں، تاکہ اسلامی اخوت کا شیرازہ مضبوط و مستحکم ہو جائے، مگر یہ مقصد کس طرح حاصل ہو؟

یہ ذرا غور طلب معاملہ تھا، غرض وہ اسی دھن میں تھے کہ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اُن کو محلہ مهندرو بانکے پور میں مولوی سید زین الدین حسین خاں بہادر سے ملاقات کے لئے جانیکا اتفاق ہوا، سید صاحب موصوف اس معاملہ میں قاضی صاحب کے ہم خیال اور ہم آہنگ تھے، اُنہوں نے قاضی صاحب کو خاص طہران (دار الحکومت ایران) کا چھپا ہوا ایک فارسی اخبار دیا، جس میں شاہ کجکلاہ ایران کا ایک اعلان یا فرمان اس مضمون کا شائع ہوا تھا کہ ما بدولت و اقبال اور ہماری تمام رعایا کو ٹرکی سلطنت کے ساتھ پوری ہمدردی ہے، دونوں حکومتوں کو ایک سمجھنا چاہئے کیونکہ شیعہ و سنی دونوں مذہب اسلام کے نام لیوا ہیں اور جو اختلافات آپس میں ہیں، وہ محض معمولی و جزئی ہیں، وہ ہماری مواخاۃ و مواساۃ کے مانع نہیں ہو سکتے، تمام شیعوں پر اس وقت ترکوں کی مدد لازم ہے۔

یہ اشتہار قریباً دو صفحہ پر زمانہ حال کی فارسی میں تھا، قاضی صاحب کو گویا منہ مانگی مراد ملی اُنہوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، شباشب اس کا ترجمہ کرایا اور صبح اُٹھ کر ایک اخبار میں چھاپنے کے لئے بھیج دیا جو سید سخاوت حسین صاحب بی اے کے زیر اہتمام انگریزی و اُردو میں علی الترتیب

"مستجر" (قاصد) کے نام سے چھپتا تھا، چنانچہ وہ ترجمہ ابھی شائع ہو گیا، لیکن قاضی صاحب نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اصل فارسی اخبار بھی سربرآوردہ شیعہ امرا کو جن کا عوام شیعہ پر اثر و اقتدار تھا خود جا کر دکھایا، قاضی صاحب کی یہ کوشش بھی کامیاب ہوئی اور اس جد و جہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ شیعہ جماعت نے بھی اس مقصد کے لیے انجمنیں قائم کیں، اور کشادہ دلی کے ساتھ چندہ دیا، اور لوگوں کو ترغیب دے کر دلوایا۔

آرٹس اسکول قاضی صاحب نے بہار کے آرٹس اسکول (مدرسۂ صنعت و حرفت) کی خود بھی مالی اعانت کی اور دوسروں سے بھی چندہ دلوایا اور ہمیشہ اس کے ایک کارگزار اور سرگرم ممبر رہے، اور بہار کے قومی دشمنوں کی جتنی کوششیں اسکول کے سرمایہ کو (جس کی مقدار اس وقت بھی ایک لاکھ روپیہ سے بہت زیادہ تھی) اولاً ٹاؤن ہال میں خرچ کرنے یا پھر سبیب پور کالج (واقع بنگالہ) میں منتقل کرنے کی ہوئیں سب کی بڑی قوت و کامیابی کے ساتھ مخالفت کرتے رہے اور جب کبھی بانکی پور کے خود غرض و بااقتدار ممبروں نے مکر و فریب سے اپنے کسی خاص مقصد کے لیے اس اسکول کی کمیٹی کا تنگ وقت میں کوئی مبہم نوٹس بھیجا تاکہ ممبر بسہولت شریک نہ ہو سکیں تو چاہے ایسی حالت میں کوئی اور ممبر شہر سے شریک نہ ہوا ہو، مگر قاضی صاحب اپنے سب کام ہرج کر کے برابر شریک ہوئے اور جو مزاحمت پیش آئی اس کو برداشت کیا، اُن کی اس سرگرمی و مستعدی اور قومی خیر خواہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج بھی وہ اسکول کامیابی سے جاری اور اپنی شاندار عمارت میں موجود ہے، جو آرٹس اسکول بھی ہے اور انجینیرنگ اسکول بھی، سچ ہے خدا کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔

انڈین کرانیکل صوبہ بہار کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو سرکاری انتظام کی حیثیت سے بنگالیوں کے ساتھ ایک ہی جوئے میں جُتنے اور انگریزی تعلیم میں اُن سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جو مصیبتیں جھیلنی پڑیں اُن کا بہت بڑا حصّہ تو عالم طفولیت یعنی بہاریوں کے عدم احساس یا فقدان بیداری کے زمانہ میں گزرا اس لیے ان مصائب کی تلخیاں زیادہ محسوس نہیں ہوئیں لیکن جب ایک حد تک تعلیم پاکر بہاریوں میں احساس و شعور پیدا ہوا تو یہ زمانہ اُن کے لیے بہت سخت تھا،

ان بہاریوں نے جب آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ ہر محکمہ اور ہر صیغہ کی راہیں اُن کے لئے بند ہیں اور ہر طرف برہنہ سر بھوتوں (بنگالیوں) ہی کی بھیانک اور وحشت خیز صورتیں نظر آرہی ہیں جس دروازہ کو کھٹکھٹایا وہاں اس کالی بلا کو مسلط پایا، گورنمنٹ کے مختلف احکام اور رزولیشن جاری ہوئے مگر یہ لوگ ایسے قابو یافتہ تھے کہ کسی پر عمل کی نوبت نہ آئی، بہاری اس بلا کا مقابلہ کس طرح کرسکتے تھے اُن کے ہاتھ میں کوئی اخبار بھی نہ تھا جس کے ذریعہ سے وہ اپنی فریاد گورنمنٹ تک پہنچا سکیں غرض یہ مجبور، وہ چست و چالاک اور ہوشیار، ان کی یہ تدبیر کہ بہاریوں سے سرمایہ جمع کرکے اُن کے صوبہ کے نام سے اخبار شائع کریں، اور اس میں اپنی سیاہ باطنی سے اپنے مفید مطلب باتیں لکھیں، غرض جب بہاریوں کی جان پر آبنی تو چند تعلیم یافتہ بہاری ہندو اٹھ کھڑے ہوئے، اور اپنے ہموطن مسلمانوں کو شریک کرکے صوبۂ بہار کی طرف سے ایک اخبار انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع کرنا چاہا۔

انگریزی سے یہ مقصد تھا کہ گورنمنٹ کو براہ راست بہاریوں کے جذبات و مطالبات کی اطلاع ہوتی رہے، اور اُن کے حقوق پامال نہ ہوں، اُردو سے یہ مقصد تھا کہ پبلک اپنے حقوق کی عظمت سے باخبر رہے، اور اپنے مطالبات و ضروریات کو سمجھے اور اس کے لئے جد و جہد کرے، قاضی صاحب نے گرمجوشی سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، اور ہر طریقہ سے اخبار کی اعانت کے لئے تیار ہوگئے، غرض ان کی اعانت سے اخبار انڈین کرانیکل جاری ہوا، اور کامیاب ہوا، یہ اخبار جب تک جاری رہا خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا، اگرچہ اب حوادث زمانہ کی وجہ سے انڈین کرانیکل صفحۂ ہستی پر باقی نہیں رہا، مگر اس کے کارنامے صوبۂ بہار کے ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل پر آج بھی نقش ہیں۔

پٹنہ ٹرمو سے کمپنی

پٹنہ ایک ایسا شہر ہے جس میں صرف طول ہی طول ہے، اور طول کی مناسبت کے لحاظ سے عرض گویا کچھ بھی نہیں، اصطلاح فن کے لحاظ سے اس پر خط کی ہندسی تعریف صادق آتی ہے بدھا کے زمانہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گنگا اور چلنے کے شکنجہ

کے سبب سے اس کا یہ عرض ایک قدرتی بات ہے، یہ شہر اگرچہ مشرقی و مغربی دو حصوں پر منقسم ہے لیکن اس کی طویل آبادی مسلسل برابر چلی گئی ہے۔

مغربی حصہ میں ہر قسم کے سرکاری دفاتر، ادنیٰ و اعلیٰ تعلیم گاہیں اور حکام و قانون پیشہ لوگوں کے مکانات و کوٹھیاں واقع ہیں، اور مشرقی حصہ میں امرا و رؤسا، ساہوکار، تجار اور ہر قسم کے پیشہ والے رہتے ہیں، اس لئے عام آبادی کی سہولت و راحت کے خیال سے ٹرام وے کی سخت ضرورت تھی، اور اس شہر کی خصوصیات کے لحاظ سے تاجرانہ نقطۂ نظر سے بھی ٹرام وے سے مالی منفعت کی اُمید تھی، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک انگریز نے کمپنی کی بنیاد رکھی، قاضی صاحب کو اس قسم کے مفید کاموں سے خاص دلچسپی تھی، اُنہوں نے محسوس کیا کہ اس شہر کو اپنی ضروریات و خصوصیات کے لحاظ سے ٹرام وے کی سخت ضرورت ہے، اور اُس کا جاری ہونا پبلک کے لئے بہت مفید ہے، اس کے علاوہ قاضی صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ صاحب استطاعت اور سرمایہ دار لوگوں کو یہ بات سکھانے کی اشد ضرورت ہے کہ زمانہ حال کے طریقۂ کاروبار کے مطابق کس طرح روپیہ سے روپیہ پیدا کیا جاسکتا ہے، ایک خیال یہ بھی تھا کہ لوگ مشترکہ سرمایہ سے تجارتی کاروبار کرنا سیکھیں، تاکہ اُن میں کاروباری حوصلہ مندی پیدا ہو، اور کسب معاش کی مختلف راہوں میں قدم اُٹھاسکیں، نیز دوامی بندوبست سے ہماریوں میں جو جمود پیدا ہوگیا ہے وہ دُور ہو اور اُن میں حرکت پیدا ہو، غرض یہ مصالح پیش نظر رکھکر جیسا کہ اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا، وہ پورے جوش و مستعدی کے ساتھ کمپنی کی مدد کے لئے تیار ہوگئے، اور حوصلہ مندی کے ساتھ خود بھی بہت سے حصے خریدے اور تمام صاحب استطاعت اعزہ و احباب اور شہر کے عمائد کو ترغیب دے کر بہت سے حصے فروخت کرادیے، قاضی صاحب نے تو اپنا فرض ادا کیا اور کوشش میں کامیاب ہوئے، لیکن خود کمپنی نے یہ کیا کہ ہر حصہ کی دو دو تین تین قسطیں وصول کرلینے اور کچھ سامان ولایت سے منگوالینے بلکہ کسی قدر کام شروع کردینے کے بعد دیوالہ نکال دیا، کسی کام میں کامیابی یا ناکامیابی تو قسمت کا کھیل ہے، اور یہ امر اختیاری نہیں۔ قاضی صاحب جو کچھ کرسکتے تھے وہ اُنہوں نے کیا، یہ

اور بات ہے کہ خارجی اسباب کی وجہ سے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

لینڈ ہولڈرس ایسوسی ایشن

بنگالہ وبہار میں جتنے اضلاع کا بندوبست دوامی ہے اُن کے زمینداروں کاشتکار کا مسئلہ جو قانون لگان بنگالہ یعنی ایکٹ ۸ ۱۸۸۵ء کی صورت میں ظاہر ہوا، سنہ مذکور سے دس برس پہلے گورنمنٹ کے زیر غور تھا، البرٹ بل نمبر ۲ اسی مضمون سے تعلق رکھتا تھا، جس کی نسبت بہت کچھ شورش اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی، لیکن چونکہ اس کا تعلق صرف بنگال و بہار ہی سے تھا اور وہ بھی عام پبلک سے نہیں بلکہ صرف زمیندار اور کاشتکار سے، اس لئے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بل نمبر ا کی طرح اس کا غلغلہ نہیں پہنچا، تاہم ایک طرف کاشتکاروں کی تباہی و بربادی اور مجبوری و بے بسی کی داستانیں شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ اخباروں، رسالوں اور ناولوں میں شائع کی جاتی تھیں، دوسری طرف طرز زمینداری کے متعلق نالہ و فریاد تھی، مصنوعی قصوں اور فرضی داستانوں کے ذریعہ سے جور وستم کے واقعات کی شہرت دیکر ۱۷۹۳ء کے مضبوط شاہی عہد وپیمان کے توڑنے کی فکریں ہوتی تھیں، اگرچہ پٹنہ کا انڈین کرانیکل اور کلکتہ کے بعض اخبار حقیقی ہمدردی سے زمینداروں کی وکالت کرتے تھے، لیکن وہ ہمہ تن صرف زمینداروں کے حقوق کی حفاظت میں مصروف و منہمک نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے زمینداروں نے یہ دیکھکر کہ ہمارے متبرک حقوق خطرہ کی حالت میں ہیں اور ہمارے اسلاف کی قریباً سو برس کی محنت اور سرمایہ ایک اشارۂ قلم سے برباد ہوا چاہتا ہے، خود اپنے مقاصد کی حمایت کا ارادہ کیا، اور سارے صوبۂ بہار کے اولوالعزم، عاقبت اندیش اور مصلحت بیں زمینداروں نے باہم ملکر اس کے لئے باقاعدہ کوشش کا آغاز کیا، یعنی پٹنہ میں ایک مستقل انجمن اس مقصد سے قائم کی، جس کا نام "بہار لینڈ ہولڈرس ایسوسی ایشن" رکھا گیا۔ قاضی صاحب نے ابتدا ہی سے اس انجمن میں شرکت کی اور حسب معمول اس کی مالی اعانت میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

پٹنہ کالج سے عربی کا اخراج

پٹنہ کالج کے پرنسپل بوئینگ صاحب نے بعض چالاک اور خود غرض

اشخاص کے مکروفریب کی باتوں میں آکر پٹنہ کالج سے عربی کو خارج کر دیا، صرف فارسی اور سنسکرت باقی رکھی، انگریزی اخبار کرانیکل میں بعض مسلمانوں نے اس کے متعلق مضامین بھی شائع کئے اور قاضی صاحب نے اس کے متعلق پرنسپل سے مراسلت بھی کی، لیکن پرنسپل نے صرف اسی قدر جواب دیا کہ گورنمنٹ عربی دفارسی دونوں کے پڑھانے کا خرچ نہیں دے سکتی، اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ کالیجیٹ اسکول اور کالج میں عربی بھی سکینڈ لینگوج رہے تو سرمایہ جمع کر کے گورنمنٹ کے سپرد کردیں اس کی آمدنی سے عربی پڑھانے کا انتظام کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے کافی سرمایہ درکار تھا اس لئے یہ کام تنہا قاضی صاحب کے بس کا نہ تھا، دوسرے امراء ورؤساء کے پہلو میں قاضی صاحب جیسا دل نہ تھا اُن کو اس ضرورت کا کیا احساس ہو سکتا تھا، اس لئے اسکول اور کالج سے عربی زبان رخصت ہوگئی پٹنہ سٹی اسکول کالیجیٹ اسکول کی ایک شاخ تھا، اس لئے یہاں سے عربی دور باش کہکر نکال دی گئی، قاضی صاحب کو جب کچھ بن نہ آئی تو مالا یدرک کلہ لایترک کلہ کو مد نظر رکھ کر اس خیال سے کہ اسکول کلاس کے مسلمان طلبہ کی زیادہ تعداد شہر ہی میں ہے یہاں خود ذاتی مصارف سے عربی پڑھانے والے کی ایک اسامی قائم کی اور اس تدبیر سے عربی کو گورنمنٹ اسکول میں سے بے نام ونشان ہونے سے بچا لیا، یہ اسامی مستقل طور پر قائم رہی اور طلبہ اس سے مستفید ہوتے رہے۔

محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ پٹنہ کے ایک مستند و پُر جوش محب وطن شمس العلماء مولوی محمد حسن صاحب نے مولوی میر احمد حسین صاحب رئیس صدر گلی پٹنہ کی ہمت و اعانت سے اینگلو عربک اسکول پٹنہ واقع صادق پور کی بنا ڈالی اور رات دن کی سعی وکوشش اور مہینوں کی لگاتار دوا دوش سے اس کی ایک صورت بھی قائم کردی، قاضی صاحب حسب عادت ابتدا سے اس تحریک میں شریک ہوئے، اور علاوہ مشیر وبہی خواہ ہونے کے بقدر استطاعت ماہانہ چندہ بھی دیتے رہے، سرمایہ اور اسکالرشپ بھی دیا، جیسے جیسے اسکول ترقی کرتا گیا قاضی صاحب کی توجہ بھی اس کی طرف بڑھتی گئی یہاں تک کہ قاضی صاحب نے وصیت نامہ میں اپنی جوڑی اور

گاڑی اس اسکول کے نام لکھدی۔

مدرسۂ احمدیہ آرہ

بہار کے ایک مشہور فاضل اور فصیح و بلیغ خطیب نے جن کا نام مولوی ابو محمد ابراہیم تھا، مدرسہ احمدیہ قائم کیا، مولویصاحب نے یہ مدرسہ قاضی صاحب کی زندگی ہی میں قائم کیا تھا یہ عربی کا مدرسہ تھا، اسکا مقصد یہ تھا کہ ایسا طریقہ تعلیم عربی پڑھانے کیلئے تجویز کیا جائے جسمیں زیادہ وقت ضائع نہو چنانچہ مولوی صاحب نے سالہا سال کے غور و فکر اور محنت و کوشش کے بعد ایک بہت سہل طریقہ عربی کی تعلیم کا تجویز کیا' اور اس مقصد کے لئے بہت سی کتابیں بھی خود ہی تالیف کیں' یہ نصاب ایسے طریقہ پر ترتیب دیا کہ طلبہ اس سے جلد فراغت حاصل کر کے اپنا وقت دین و دنیا کے دوسرے ضروری کاموں کیلئے بچا سکیں' اپنے مجوزہ نصاب کا عملی تجربہ کرنے اور اس کو کامیاب بنا کر دکھانے کے لئے مولانا ابراہیم صاحب نے مدرسہ احمدیہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کے لئے دار الاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) بھی قائم کیا۔

قاضی صاحب نے اس مدرسہ کی بھی حمایت و تائید کی اور ماہانہ چندہ بھی مقرر کیا' قاضی صاحب اپنے اصول کے اس قدر پابند تھے کہ جب مرض الموت میں ان کی رحلت سے دو چار روز پہلے مولوی ابراہیم صاحب عیادت کے لئے آئے اور رخصت ہو کر چلے تو ان کو پھر بلوا کر پوچھا کہ مدرسہ کی کن کن مدات کی بابت میرے ذمہ کس قدر رقم واجب الادا ہے' مولوی صاحب نے جو حساب بتایا اُسی وقت خانساماں کو بلوا کر بیباق کر دیا۔

مدرسہ اسلامیہ بہار شریف

ایک دیندار اور مخلص و پرہیزگار عالم مولوی سید وحید الحق صاحب استھانوی بہاری نے شدید و مسلسل محنت اور پیہم کوشش کے بعد قرآن مجید فارسی اور درس نظامی کے مطابق عربی تعلیم کے لئے بہار میں ایک مدرسہ قائم کیا' قاضی صاحب نے اپنے آخر زمانہ میں اس مدرسہ کے لئے بھی ماہانہ چندہ مقرر کیا' اور اگرچہ وہ کوئی بڑی رقم نہ تھی تاہم وہ مرتے دم تک اس کو نہ بھولے' اور اپنے انتقال سے پہلے چندہ کی پوری رقم بیباق کر دی'

استھانواں اسکول

مسلمانان استھانواں (بہار) نے اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم' قرآن مجید' اور چوتھے درجہ تک کی انگریزی کے لئے جو اسکول قائم کیا تھا قوم و وطن کے سچے ہی خوا

اور پاکباز و متقی عالم مولوی سید رحیم الدین صاحب کی تحریک پر قاضی صاحب نے اس کے لئے بھی ماہوار چندہ مقرر کیا، اور جب تک یہ اسکول باقی رہا وہ برابر چندہ ادا کرتے رہے۔

مدرسۃ البنات حکیم احمد حسین صاحب صوفی

حکیم احمد حسین صاحب نے جو عالم طبیب اور اچھے فارسی داں تھے، مدتوں غور و فکر کرنے کے بعد لڑکیوں کے پڑھانے کا ایک عمدہ و کارآمد قاعدہ ایجاد کیا تھا، اور اس کا حیرت انگیز عملی ثبوت بھی پٹنہ کے رؤسا و عمائد کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

چار پانچ برس کی لڑکیوں کو وہ تین چار مہینوں میں خود اپنی تصنیف کی ہوئی الف با، اس طور سے پڑھا دیتے تھے کہ اُن میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی تھی کہ جہاں سے کلام اللہ جلی یا خفی خط کا اُن کے سامنے رکھ دیا جائے کل قواعد تجوید کی کامل رعایت کے ساتھ وہ بے تکلف پڑھ دیں، اور حروف کو اُن کے صحیح مخارج سے ادا کر سکیں۔ اس کے بعد عبارت کلام اللہ کی مشق کراتے اور ترجمہ پڑھاتے تھے۔ اور اس کے ساتھ صرف کی ایسی مشق کراتے تھے کہ قرآن مجید کے سب صیغے معتل و غیر معتل لڑکیاں نہایت صحت کے ساتھ بتاتی تھیں۔ اور پورے دو سال میں اُن کو کلام اللہ کے صرف و نحو و ترجمہ میں مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ پہلے لڑکیوں کے دل میں پڑھنے کا شوق پیدا کر دیتے تھے۔ جب تک اُن کو شوق نہیں پیدا ہوتا تھا پڑھانا شروع نہیں کراتے تھے۔ اُن کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ ہر ایک لڑکی کو جو ان کے یہاں پڑھنے آتی تھی اپنے آپ سے اس قدر مانوس کر لیتے تھے کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں ماں باپ سے بڑھ کر معلم صاحب کی گرویدہ ہو جاتی تھیں اور اُن کا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا تھا اور چونکہ وہ معمر آدمی تھے اس لئے لڑکیاں اُن کو دادا کہتی تھیں۔ جب وہ پڑھنے کو آتیں تو کوئی اُن کے سر پر بیٹھتی تھی کوئی زانو پر کوئی گود میں۔ اُنہوں نے اُن کے پرچانے کے لئے کچھ انوکھے کھیلوں کے سامان بھی جمع کر رکھے تھے جن سے لڑکیوں کی بڑی دلبستگی ہوتی تھی۔ اور اس وجہ سے صبح ہوتے ہی لڑکیاں اپنے والدین سے تقاضا کرتی تھیں کہ ہمیں جلدی دادا کے یہاں پہونچا دو

تعلیم کے ساتھ وہ گراں نہ گزرنے والے اور محبت و پیار کے طریقہ سے ادب و تمیز نشست و برخاست، ستر پوش لباس پہننے اور خلاف حیا پوشاکوں سے بچنے کا بھی ایسا سبق دیتے تھے کہ عمر بھر بھلا یا نہ جا سکے۔ بہت ہی کمسن یعنی چار پانچ برس کی بہت سی بچیوں سے وہ احباب و اقران کے مجمع میں اور ذرا بڑی عمر کی لڑکیوں کو پردہ میں بٹھا کر صرف خاص خاص لوگوں کے سامنے امتحان دلواتے تھے۔ چنانچہ قاضی صاحب ایسے متعدد امتحانوں میں شریک ہوئے تھے جن میں سے دو میں راقم بھی موجود تھا اور بارہا خود صوفی صاحب کے مکان پر بھی جا کر لڑکیوں کے طرز تعلیم کو دیکھا تھا اور خود ان کا امتحان لیا تھا۔ قاضی صاحب اس مدرسہ کے بڑے حامی و معاون تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ سرسید احمد خاں بہادر سے بھی جو ممبری کونسل کے زمانہ میں کلکتہ سے آتے جاتے چند مرتبہ قاضی صاحب کے مہمان ہوئے تھے اس مدرسہ کا حال بیان کیا تھا۔ سرسید کو سخت حیرت و استعجاب ہوا۔ قاضی صاحب اور شمس العلماء مولوی محمد حسن صاحب صادقپوری کو ساتھ لیکر اس مدرسہ کا معائنہ کیا اور خود لڑکیوں کا امتحان لیا اور کہا کہ باوجود اس کے کہ میں اپنے مدرسۃ العلوم کے سوا کسی کام میں ایک حبہ بھی دینا گوارا نہیں کرتا اس مدرسہ کو خاص اپنی جیب سے دس روپیہ ماہانہ دیا کروں گا۔

مدرسہ دوندی بازار پٹنہ

ایک مدرسہ قاضی صاحب کے پیر و مرشد جناب مولانا سید امیر الحسن قدس سرہٗ کے بڑے صاحبزادے جناب مولانا سید امین اللہ صاحب نے جن کے ساتھ قاضی صاحب کو اس روحانی و ایمانی تعلق کے علاوہ نہایت ہی خلوص و محبت بھی قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ میں پورے سلسلۂ نظامیہ کے علاوہ اردو میں انگریزی ترجموں سے حساب و ہندسہ بھی پڑھایا جاتا تھا۔ افسوس ہے کہ تقریباً چودہ پندرہ سال تک غریب مسلمان طلبا کو فائدہ پہونچا کر قاضی صاحب کی وفات سے چند سال پیشتر مولانا امین اللہ طاب اللہ ثراہ کی نفع رساں و فیض بخش حیات کے ساتھ اس مدرسہ کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ قاضی صاحب اس مدرسہ کے روح رواں تھے۔

عطیۂ زمین

گیا ریلوے لائن کے مسوڈھی اسٹیشن سے قاضی صاحب کے آبائی مسکن سائین تک جس کا فاصلہ پانچ میل ہے کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ گو قاضی صاحب وہاں بہت ہی کم جاتے تھے لیکن خود اپنے اور نیز علامۂ خلائق کے آرام کے لئے پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں اس سڑک کے لئے تحریک کی اور جس قدر اراضی خود قاضی صاحب کی اس سڑک میں آئی (جس کی مقدار کچھ کم نہ تھی) اس کی قیمت ڈسٹرکٹ بورڈ سے نہیں لی۔ علیٰ ہذا اُن کے سسرالی مکان واقع شہر پٹنہ کے مشرقی بازو سے جو چھوٹی سی سڑک میونسپلٹی پٹنہ نے نکالی اس میں بھی جس قدر اُن کی سسرالی زمین آئی اس کی قیمت میونسپلٹی کو معاف کر دی۔

قرآن مجید اور مثنوی معنوی کی خدمت

قرآن مجید اُن کا دین و ایمان و حرز جان تھا اور مثنوی معنوی شعار و دثار و مونس ہمدم تھی۔ خلوت و جلوت سفر و حضر بیماری و صحت ہر حال میں یہ دو چیزیں ان سے مرض الموت تک جدا نہ ہوئیں۔ اپنے دائرۂ ارادت کے اندر ہر شخص کو قرآن مجید معنے کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے کی ہمیشہ نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا یہ قول بالکل سچا قول تھا کہ مسلمانوں سے یہ خیال بالکل اُٹھ گیا ہے کہ قرآن مجید بھی بقدر استعداد ہر شخص کے مستفید ہونے اور سمجھنے کی چیز ہے جس طرح ہندوؤں نے ویدوں کا پڑھنا اور سمجھنا صرف برہمنوں ہی کے ذمہ ڈال دیا ہے اسی طرح مسلمانوں نے قرآن مجید کا سمجھنا صرف علماء پر چھوڑ دیا ہے۔ اور پھر علماء کا بھی یہ حال ہے کہ اُن کے نصاب درس میں اور وہ بھی فاتحہ فراغ کے وقت صرف ایک پارہ بیضاوی شریف کا رکھا گیا ہے اور بس۔ اور میں ذاتی تجربہ سے جانتا ہوں کہ ہندوستان کے ان طلبہ میں سے جو فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں شاید فی صدی پانچ بھی دستار بندی کے بعد قرآن مجید کو بالاستیعاب معانی و مطالب سمجھ کر نہیں پڑھتے اور باوجود مولوی کہلانے کے عمر بھر قرآن مجید سے محض نابلد بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ اور یہ بھی اس فرض کو اپنے ذمہ لیا سے صرف اُن ہی معدودے چند اشخاص کے حوالہ کر دیتے ہیں جو واعظ بن کر اپنی زندگی صرف کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی اکثر

اِدھر اُدھر سے چند رکوع سمجھ کر مشق کر لیتے اور اُن ہی کو سرمایۂ زندگی بنا لیتے ہیں۔ ابقیہ لوگوں میں قرآن مجید کے صرف تین مصرف ہیں۔ ایک تو دُکھ درد ہرج مرج میں تعویذ و منتر کے طور پر۔ دوسرے کشائش رزق، حصول مطلب، مقہوری اعدا وغیرہ کے لئے وظیفہ کے طرز پر کام میں لانا۔ اور تیسرے محض ثواب کے لئے بغیر سمجھے ہوئے تلاوت کر لینا یا ویسے ہی ناظرہ خوانوں یا حافظوں سے مُردوں کے ایصال ثواب کے لئے ہلکم تک بہ اُجرت پڑھوا دینا۔ حالانکہ اسکو انسان چاہے جس نیت سے تلاوت کرے اگر معنی و مطلب سمجھ کر پڑھے تو اُس کے اخلاق و اعمال پر بے انتہا اثر پڑے اور ہر قسم کے فائدے اُس سے حاصل ہوں۔

ہر شخص اپنی استعداد و قابلیت کے موافق قرآن مجید سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص اس اعتقاد و ایمان کے ساتھ کہ یہ اللہ جل جلالہٗ کا کلام معجز نظام اور حکم واجب الاذعان ہے کہ

"یتیم پر ظلم نہ کرو۔ باپ ماں کو اُف بھی نہ کہو۔ جو شخص ظلم سے یتیم کا مال کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے۔ جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہے۔ زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیونکہ یہ بُری راہ ہے۔ امانت ادا کرو۔ رشوت نہ دو۔ آپس میں لڑو جھگڑو نہیں۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ شراب و جوا ناپاک شیطانی کام ہیں، ان سے بچتے رہو۔ والدین اولاد، اور قرابت مندوں کے حقوق پہچانو۔ اور سب سے مقدم تر یہ کہ خدا کی کسی صفت میں بھی کسی پہلو سے بھی شرک تو ہرگز ہرگز نہ کرو کہ یہ گناہ تو معاف ہی نہیں ہوتا۔"

علیٰ ہذا اور بہتیرے ہدایات جو انسان کو انسان اور انسان کامل بنانے والے ہیں بار بار پڑھے گا وہ کیونکر اثر حاصل نہ کرے گا۔

اُن کی تاکید قرآن مجید پڑھنے کی نسبت صرف قولی ہی نہ تھی بلکہ عملی و فعلی تھی۔ جب اُن کا

خیال اس طرف رجوع ہوا تو ایک عالم کو نوکر رکھ کر پورا قرآن مجید پہلے خود سمجھ کر پڑھا۔ اور خیال امارت و وجاہت غرور ریاست اور جبلہ ہجوم کار و کثرت افکار کوئی چیز بھی آن کے اس سچے شوق کی ذرّہ برابر بھی سدِ راہ نہ ہوئی۔ اور جیسا کہ اُن کی پُرجوش و نفع رساں طبیعت کا خاصّہ تھا اپنے ہر ایک دوست اور عزیز کو اس کا شوق دلایا۔ پیارے چھوٹے بھانجے عبدالسّلام مرحوم کو جس نے عنفوان شباب میں انٹرنس تک پہونچ کر اُن کے سامنے انتقال کیا اور جس کی اُنہوں نے ابتدا سے خود تعلیم و تربیت کی تھی انگریزی کے علاوہ عربی کی صرف اس قدر صرف نحو ادب پڑھا کر جس سے عبارت پڑھ سکے اور معمولی و روزمرّہ کے الفاظ کے معنی کہہ سکے خود قرآن مجید پڑھانا شروع کیا تھا۔ یہاں تک کہ جس وقت وہ عزیز بچّہ تقریباً چودہ پندرہ سال کی عمر میں علی گڑھ بھیجا گیا اور وہاں کے فورتھ کلاس میں داخل ہوا اُس وقت وہ قرآن مجید کے چھٹے پارہ تک پہنچا تھا اور ابتدا سے اس طور پر قرآن مجید پڑھتا تھا کہ بغیر ترجمہ کا کلام اللہ اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور عبارت پڑھ کر وہ معنی کہتا تھا اور جہاں کوئی نیا لغت آیا یا کوئی مشکل ترکیب آئی وہاں اس کو بتا دیا جاتا تھا۔ جب تک وہ اُن کے پاس رہا خود پڑھاتے رہے اور جب علی گڑھ میں اس کو ایک نگراں کے سپرد کیا تو اس کو اسکول کے ضروری مضامین کے علاوہ اُسی طرز پر کلام مجید پڑھانے کی بھی تاکید فرمائی۔

یہ تو ایک چھوٹی سی مثال تھی۔ سب سے بڑی مثال وہ جلسہ قرآن خوانی ہے جو تقریباً تین سال تک ہفتہ میں دو روز پابندی کے ساتھ ہوتا رہا۔ اس کا اصل باعث تو ڈاکٹر صدر الحق صاحب اور اعظم علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر سٹی اسکول پٹنہ تھے اس لئے یہ دونوں حضرات خدا ان کو اجر جزیل عطا فرمائے اس مقدس جلسہ کے جزو لاینفک تھے۔ اور میرے دوست مولوی حکیم لطیف حسین صاحب کا نمبر بھی باعتبار مداومت حاضری کے مقدم الذکر دونوں حضرات کے قریب قریب تھا۔ اس متبرک جلسہ کے حاضرین کی اوسط تعداد میرے خیال میں پندرہ بیس سے کم نہ تھی یہ ایک عام و بے قید جلسہ اور سب مسلمانوں کے لئے صلائے عام تھا۔ جس شخص کا جی چاہتا تھا

اس میں جاکر شریک ہوتا اور اس سے مستفید ہوتا اور اکثر اس سے ایسا متاثر اور اس کا ایسا
گرویدہ ہو جاتا تھا کہ اس میں برابر شریک ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔
مغرب کے قبل لوگوں کی آمد شروع ہوتی تھی۔ بعد نماز مغرب ہلکا سا ناشتہ بلحاظ فصل و
موسم اور چائے سب کے سامنے یکساں طور پر بلا امتیاز پیش کی جاتی تھی اور پان وحقہ کی معمولی خوت
ہوتی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹہ کے اندر اس سے فراغت کے بعد حقے وغیرہ اٹھوا کر بہت بڑی لانبی
میز پر (جس کے دونوں جانب کوئی بیس بائیس کرسیاں بچھی رہتی تھیں) بڑے بڑے لیمپ کھڑے
جاتے تھے جن کی روشنی میں کلام مجید کا درس شروع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یا خان صاحب جن کا
ذکر اوپر ہو چکا ہے (بے ترجمہ) کلام اللہ سے عبارت پڑھتے اور معنی کہتے تھے اور جناب قاضی صاحب
بہت ہی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر میں اُن کے مطالب بیان کرتے تھے۔ اور پھر جو کوئی اس کے
متعلق کچھ پوچھتا تھا اُس کو بتا دیتے تھے۔ پاس ہی تفسیر کشاف بھی رکھی رہتی تھی اکثر جلسہ میں مولوی
محمد لطیف حسین صاحب کے علاوہ دوتین علما بھی موجود رہتے تھے۔ اور خود جناب قاضی صاحب
چونکہ پڑھانے کے لئے اچھی طرح سے تیار ہو لیتے تھے اس لئے نہ زیادہ دقتیں پیش آتی تھیں اور نہ
غیر معمولی رکاوٹیں۔ پڑھنے والوں اور بالقصد شریک ہونے والوں کو اس سے جو فائدہ پہنچتا تھا
وہ تو ظاہر ہے۔ ان کے علاوہ جو لوگ اتفاقی طور پر اُس وقت وہاں پہنچ جاتے اور شریک جلسہ
ہو جاتے تھے اُنکے دلوں پر بھی باوجود سادگی بیان کے جس میں نہ مثنوی کی چاٹ ہوتی اور نہ نقلوں
اور حکایتوں کا نقل ایسا اثر ہوتا تھا جو علمار ربانی کے وعظ میں ہوتا ہے۔
جلسۂ قرآن مجید کی ربانی برکت نے قاضی صاحب کی خالص نیت اور بافیض صحبت سے
ملکر لوگوں پر کچھ ایسا عمدہ اور گہرا اثر کیا کہ بہتیرے لوگوں کی کایا پلٹ ہوگئی اور اُن کی حالت بدل
گئی جن میں سے اکثر بزرگ آج بھی پٹنہ میں موجود ہیں اور زبان حال اور زبان قال سے شہادت
دیتے ہیں کہ وہ کس حضیض حیوانی سے کیسے مدارج انسانیت تک ترقی کر گئے ہیں۔ واقعی یہ لوگ انسانی
واسلامی اخلاق میں اس وقت اپنے نمونہ آپ ہیں۔

اس مبارک جلسہ میں ایک مرتبہ پورا کلام مجید بالاستیعاب پڑھا گیا اور دوسری مرتبہ چودھویں پارہ تک پہونچا تھا کہ ڈیپوٹیشن کے باعث حیدرآباد کا سفر پیش آیا جو بعد کو اُن کے سفر آخرت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ اس سفر کے تہیہ کے وقت قاضی صاحب نے قرآن مجید پڑھانے کا جلسہ مولوی محمد لطیف حسین صاحب کے سپرد کیا جو ایک بڑے لائق و قابل عالم ہونے کے علاوہ نہایت نیک طینت، سنجیدہ طبیعت صاحب خلوص و بے ریا آدمی تھے اور جنھوں نے قاضی صاحب کے مرشد زادہ مولانا مولوی امین اللہ طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ کی بافیض صحبت تعلیم اور اُن کے انتقال پُر ملال کے بعد خود قاضی صاحب کی صحبت میں اسلامی دردِ دل بھی اور پھر زندہ دل کی دوا بھی پالی تھی اس متبرک جلسہ کو جس کو قاضی صاحب کی خیرات جاریہ کا ایک یادگار کہنا زیبا ہے۔ زندہ رکھا۔ صاحب استقامت واستقلال کرمنا ڈاکٹر صدر الحق اور مخدومنا اعظم علی خاں خدا ان دونوں کے مدارج بڑھائے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس جلسہ کے روح رواں تھے اس لئے یہ جلسہ قاضی صاحب کے بعد سے ڈاکٹر صاحب موصوف کے مہمان نواز کاشانہ پر منعقد ہوتا رہا اور شکر کی جگہ ہے کہ قاضی صاحب کا یہ جلسہ سلسلہ بہ سلسلہ جاری رہا اور کسی نہ کسی صورت میں آج بھی جاری ہے۔

مکرمنا ڈاکٹر صدر الحق اور جناب میر محمد کلیم صاحب کچھ بھی عربی پڑھے ہوئے نہ تھے مگر یہ تجربہ ہے کہ قرآن مجید کی جو آیت بھی اُن سے پوچھی گئی اُس کے معانی ومطالب کو بیان کر دیا اور سمجھا دیا جس سے آج کل کے بہتیرے اہل علم عاجز ہیں۔ ایسے حضرات جلسہ میں سے اور بھی ہو گئے یہ اُس جلسہ کا ایک ادنیٰ فیض تھا جس کو ہر کوئی جان سکتا اور دیکھ سکتا تھا۔ یہ دونوں حضرات عربی سے محض ناآشنا تھے۔ قاضی صاحب نے اُن کو بتایا کہ صیغہ کو بھی لغت سمجھ لو۔ اور جتنے الفاظ معلوم نہ ہوں سب کو کاپی پر نامعلوم المعنیٰ لغت کی طرح لکھ لو اور یاد کر لو۔ مثلاً یقولوں کے معنی کہتے ہیں (وہ کہتے ہیں یا کہیں گے) قرآن مجید کا جس طرح یہ معجزہ ہے کہ اتنی بڑی کتاب اور لغات بہت کم، اسی طرح یہ بھی معجزہ ہے کہ جس طرح آپ پڑھوں گویا د ہو جاتا ہے اسی طرح آن

پڑھوں کو تھوڑی توجہ سے معانی و مطلب سے بھی بہرہ حاصل ہو جاتا ہے۔ قرآن ہادی ہے وہ ہدایت کرنے کو موجود ہے اگر کوئی اس سے ہدایت چاہے۔ قاضی صاحب کی خواہش ہوئی کہ ایسی تراویح سنوں جو واقعی عبادت ہو۔ یعنی حافظ اتنا ٹھہر ٹھہر کر تراویح میں قرآن پڑھے جو سننے والا بفراغ خاطر اس کے معنی سمجھتا جائے مگر اس کا انجام پانا آسان نہ تھا کیونکہ حفاظ سوائے چند مخصوص اور مشق کی ہوئی سورتوں اور رکوعوں کے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے عادی نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے عزیز حافظ سید فضل حق صاحب آزاد کو جن کی تعلیم و تربیت انہی کی رائے سے اور انہی کی زیر نگرانی ہوئی تھی اور جن کی قرأت و لہجہ کو وہ بغایت پسند کئے ہوئے تھے بلایا اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ میری یہ خواہش تم ہی سے انجام پا سکتی ہے میرامیر خاں صاحب کی مسجد میں تراویح شروع ہوئی ایسی تراویح بھی کم سنی گئی ہو گی۔ حافظ احمد شاہ صاحب جو قاضی صاحب کے دوست اور بہت اچھے حافظ تھے ساتھ اس کے فن موسیقی میں استاد تھے کہنے لگے کہ حضرت جبریل نے جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں قرآن پڑھا ہو گا وہ اسی لہجہ اور اسی ترتیل سے پڑھا ہو گا۔ قاضی صاحب مانگی مراد پا کر اس قدر خوش ہوئے جس کی کوئی حد نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ جناب قاضی صاحب نے اپنے قول و فعل۔ علم و عمل۔ سعی و محنت سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا بیج پڑھنے والوں کے دلوں میں نہ صرف تخم ہی بویا بلکہ اس کو پروان چڑھایا اور اپنے سامنے ہی ایک حد تک پھولا پھلا ہوا دیکھ لیا فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ خدا کرے کہ تمام مسلمانوں میں یہ شوق اور بھی ترقی کرے تاکہ صحابہ کا زمانہ پھر لوٹ آئے۔ لوگوں کو مذہب اسلام کا پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔ اور اُن کے دل و دماغ، افعال و اعمال، حرکات و سکنات، اور اخلاق و عادات سب میں کلام مجید رچ جائے۔ اور قرآن مجید پر ایمان قولاً کی طرح قلباً اور عملاً بھی حاصل ہو اور خدا کرے کہ اس تبلیغ دین کی سچی خدمت کا ثواب قاضی صاحب مرحوم و مغفور کی روح پر فتوح کو خیر جاریہ کی طرح پہونچتا رہے۔

ایں ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد ــ بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن ۔۔۔ تا بماند نام نیکت برقرار

دوسری مونس و ہمدرد اُن کی مثنوی معنوی تھی۔ یہ بھی سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتی۔ اس کے صوفیانہ و حکیمانہ مضامین ان کے رگ و پے میں اثر کئے ہوئے تھے اور سینکڑوں اشعار اُن کو ازبر تھے۔ اُن کی تحریر و تقریر میں بے ساختہ اور بلا آورد مثنوی کے اشعار استعمال ہوتے تھے۔ اور جو کوئی اُس کے پڑھانے کی درخواست کرتا تھا اُس کو بڑی خوشی سے پڑھاتے تھے۔ چنانچہ ایک بوڑھے حکیم صاحب جن کی ریش دبرودت کل سفید اور خود قاضی صاحب سے اُن کی عمر بہت زیادہ تھی کئی سال تک بلاشرکت غیرے مثنوی کا سبق لیتے اور اُس کے متعلق اپنے شکوک و شبہات رفع کرتے رہے۔ ان کے علاوہ اُس جلسۂ عام میں جو قرآن مجید کی وجہ سے منعقد ہوا تھا ہفتہ میں ایک روز مثنوی کا درس بھی ہوتا تھا۔ جس سے بہت سے آدمی مستفید ہوتے اور جس کے فیض سے کتنے آدمی مذہبی واعظ اور مثنوی خواں بن گئے۔

پانچواں باب

حسن معاشرت، امانت، دیانت، رحم و انصاف، تحمل، صلح جوئی، احسان، صاف گوئی، اختلاف رائے
نصیحت پذیری، علم کی قدر، اصابت رائے

حسن معاشرت جب تک قاضی صاحب کے بھائی زندہ رہے تو بھائی بھائی میں دوئی نہ تھی۔ نہ کبھی کوئی قصہ ہوا نہ جھگڑا۔ بھائی کے انتقال کے بعد اُن کی بیوی کے ساتھ جب تک وہ زندہ رہیں اُن کی دل شکستگی و حقوق کو ہرگز فراموش نہ کیا۔ سارے معاملات نہایت صفائی کے ساتھ انجام پاتے رہے۔ سسرال میں مولوی شبیر علی صاحب کی چھ بیٹیاں تھیں منجھلی ان سے بیاہی تھیں جو اب تک حی و قائم ہیں ان کے سوا اور سب کی اولادیں بھی تھیں۔ ایسا بھرا گھر تھا جس کی مثال کم دیکھنے میں آتی ہے باوجودیکہ معیشت وجہ فتنہ و فسا د حسب رسم زمانہ اس گھر میں بہت زیادہ تھی کچھ کم نہ تھی اور قاضی صاحب کو زیادہ تر بالخصوص آخر زمانہ میں سسرال ہی

میں رہنے کا اتفاق ہوا مگر وہ رہے پھول کی طرح جس کی خوش رنگی سے سب کی آنکھیں ٹھنڈی اور جس
کی خوشبوؤں سے سب کے دماغ معطر تھے۔ وہ گھر بھر کے پیارے تھے اور ان ہی کے ساتھ سب کے
دلوں میں اُن کی عظمت تھی۔ نہ بیوی سے نہ ساس سے نہ سالی سے کسی سو مزاجی کی بھنک سُنی گئی
نہ سالڑھوؤں سے۔ ان سے کسی کا کیا جھگڑا ہوتا یہ تو اُس گھر کے سارے جھگڑوں کے بھی خواہ و
دلسوز فیصلہ کن تھے۔ اُس گھر میں ایک عزیز کو بیوی سے کچھ رنج پہونچا قاضی صاحب کو معلوم ہوا
اُنہوں نے تخلیہ کی ملاقات میں اُس عزیز سے فرمایا کہ جانتے ہو کہ دنیا بہشت کیونکر ہو جاتی ہے اُنہوں
نے کہا نہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آج سوچو اور کل جواب دینا۔ دوسرے دن بھی اُس
نے وہی جواب دیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ سنو بلکہ یاد رکھو کہ دنیا بہشت ہو جاتی ہے معاف
کرنے کی عادت سے۔ مثلاً کسی کو بیوی سے رنج پہونچا تو گھر اُس کے لئے جہنم ہے۔ معاف کر دیا تو
دل کا کانٹا نکل گیا اور وہ جہنم جنت ہو گیا۔ جہنم میں ہے تکلیف اور جنت میں ہے راحت۔ جب
تکلیف پہنچی گھر جہنم ہو گیا۔ راحت پہنچی تو بہشت ہو گیا۔

قاضی سے ملنے والے اپنے بیگانے سب یہ سمجھتے تھے کہ قاضی کو ہم سے ایک خصوصیت
خاص ہے۔

اعزہ واقربا سے برتاؤ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ پہلے میں اپنے ایسے بھائیوں کو جو بدچلن
بدوضع بدطینت اور بدمزاج تھے بُری نگاہ سے دیکھتا اور اُن کو کبھی رعایت وعنایت کا مستحق
نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مدینۂ طیبہ کے سفر میں ایک واقعہ پیش آیا جس نے میرے اس خیال کو بالکل
ہی بدل دیا اور اُس زمانہ سے میں اپنے قرابت مندوں عزیزوں اور ملاقاتیوں کے ساتھ اُس
خصوصیت کے لحاظ سے برتاؤ کرتا ہوں جو اُس کو میرے ساتھ ہے گو اُس کے ذاتی افعال کیسے
کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اُس کا حق مجھ پر ہے اور اُس کی بدوضعی وبداعمالی کی وجہ سے میں تو اپنے
حق سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ جس قافلہ میں کہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کو میں روانہ
ہوا اُس میں ایک اونٹ پر دو آدمی تھے جن میں سے ایک شخص صاحب رسوخ ذی مقدور شرفا

مکہ میں سے اور بہت نیک طینت سنجیدہ اور نیک چلن آدمی تھا۔ اور دوسرا اس کے برعکس سخت جھگڑالو شریر اور بدچلن۔ آخرالذکر برابر راستہ میں قافلہ کے بدوؤں سے لڑتا جھگڑتا اور طرح طرح کی شرارتیں کرتا جاتا تھا۔ کئی دن جب اسی طور پر گذرے تو بدوؤں کے شیخ نے ایک منزل میں پہونچ کر پڑاؤ کے بیچ میں آگ جلائی جس کے معنی یہ تھے کہ ایک جنرل میٹنگ کا اعلان دیا گیا چنانچہ قافلہ کے کل ساربان بدوا ور مسافرین از قسم ذکور اس میدان میں اکٹھے ہوگئے تو بدوؤں کے شیخ نے اس مجمع میں اس شریر جھگڑالو شخص کی شرارتوں کا اور اس پر جتنے الزام تھے اُن کا بیان کیا۔ اور اس کے رفیق سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہم نے اس وقت تک صرف آپ کی وجہ سے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا اور اسی وجہ سے اب میں آپ سے باضابطہ درخواست کرتا ہوں کہ اس کو ہمارے حوالہ کر دیجئے ہم اس کو اس کی شرارتوں کی سزا دیں گے۔ اس شریف عرب نے کہا کہ میں نہیں دے سکتا۔ اس پر شیخ نے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ الزام جھوٹے ہیں؟ اور کیا آپ کے نزدیک یہ سزا کا مستحق نہیں ہے؟ اس شخص نے کہا کہ نہ میں الزاموں کو جھوٹا کہتا اور نہ میں اس شخص کو سزا سے بری ہونے کے لائق سمجھتا ہوں۔ لیکن چونکہ یہ شخص میرا رفیق ہے اس لئے میرا فرض یہ ہے کہ اس کا ساتھ دوں۔ اس کی رفاقت کا حق میری گردن پر ہے اس لئے جہاں تک میرے امکان میں ہے اس کی حمایت کروں گا۔ ہاں اگر تم اس کو مجھ سے زبردستی چھین سکتے ہو تو چھین لو۔ اس لئے کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر کوئی شخص میری رفاقت نہ کرے گا۔ اور مجھکو بے حمیت اور حق رفاقت سے بے پروا سمجھے گا۔ اس کے اس کلام سے شیخ اور کل بدو مجبور رہ گئے اور وہ شخص بچ گیا۔ اسی وقت سے میں نے بھی یہ سوچا کہ دو چیزیں جدا جدا ہیں ایک تو ہر شخص کے اپنے اعمال اور دوسرے اُس کا حق دوسروں پر۔ جس کے جیسے اعمال ہوں گے ویسی جزا و سزا دنیا و عقبیٰ میں اس کو ملے گی لیکن اس کے حقوق جو دوسروں پر ہیں وہ تو بداعمالی اور بدوضعی کے باعث ساقط نہیں ہو جاتے اگر میرا کوئی بھائی بدوضع و بدچلن ہے تو ہوا کرے لیکن میرا بھائی تو ہے مجھے اس کے ساتھ ہر حال میں وہی برتاؤ کرنا چاہئے جو بھائی ہونے کی حیثیت سے مجھ پر واجب ہو۔

اسی کی تمثیل میں انہوں نے ایک اور واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ ان کی زمینداری میں فوجداری ہوئی۔ اور اُس زمانہ میں مسٹر براڈلے بہار کے سب ڈویژنل افیسر تھے۔ چونکہ ان کے ملازمین کی زیادتی ثابت ہوئی اس لئے وہ سزایاب ہوئے۔ اور قاضی صاحب کی طرف سے عدالت ضلع میں اُس کا مرافعہ (اپیل) دائر ہوا۔ جس زمانہ میں کہ بہار میں یہ مقدمہ دائر تھا افسر مذکور نے اس خیال سے کہ اُس نے سُنا تھا کہ قاضی رضا حسین بڑے سچے اور دیانتدار آدمی ہیں کئی مرتبہ چاہا کہ قاضی صاحب اُس سے ملیں لیکن قاضی صاحب ٹالتے رہے۔ جب مقدمہ فیصل اور اُس کا مرافعہ بھی دائر ہو گیا تو قاضی صاحب اُس سے ملے۔ اُس نے پوچھا کہ کیا آپ کے ملازم واقعی مجرم نہ تھے؟

قاضی صاحب۔ تھے۔

براڈلے۔ تو جو سزا ان کو دی گئی وہ حق بجانب تھی یا نہیں۔

قاضی صاحب۔ تھی۔

براڈلے۔ پھر آپ نے اپیل کیوں کیا۔

قاضی صاحب۔ اس لئے کہ یہ میرا فرض تھا جس طرح سے کہ سزا دینا آپ کا فرض تھا۔ اُسی طرح اُن کے بچاؤ کی فکر کرنا میرا فرض تھا۔ آپ نے اپنا فرض ادا کیا میں نے اپنا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو آپ ہی فرمائیے کہ کوئی شخص میری ملازمت میں رہ سکتا اور میری زمینداری کا کام کسی طرح چل سکتا۔

اس جواب کو سُنکر براڈلے بھی مان گیا اور کہنے لگا کہ میں نے آپ سا سچا صاف گو اور ادائے حق کا راست روی سے خیال کرنے والا نہیں دیکھا۔ اور اُس دن سے وہ اُن کا سچا دوست بن گیا۔

ایک شخص قاضی صاحب کے قدیم ملازم تھے جنھوں نے بچپن میں قاضی صاحب کو پڑھایا بھی تھا۔ ایک دفعہ اُس کام کے متعلق جس پر وہ مامور تھے اُن سے کوئی قصور سرزد ہوا۔ قاضی صاحب نے ان پر جرمانہ کیا۔ اس کا اُن کے دل پر بہت اثر ہوا اور اُنہوں نے کہا کہ قاضی صاحب نے اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ میں نے اُن کو گودوں میں کھلایا اور پڑھایا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ سُنکر کہا کہ وہ حیثیت اور وہ حق علیحدہ ہے اور یہ حیثیت اور حق علیحدہ۔ آپ میری ملازمت سے

الگ ہو جائیں تو میں آپ کی ویسی ہی توقیر و تعظیم کروں گا جیسی اُستاد کی کرنی چاہئے ہر حیثیت اور ہر قسم کا فرض جداگانہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ قاضی صاحب کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے تو ہمیشہ جب تک وہ زندہ رہے ان کے حق اُستادی و قدامت میں کبھی فروگذاشت نہ کی۔

اپنی آمدنی و خرچ کا حساب خود اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور اس کی سخت نگہداشت کرتے تھے کہ خرچ آمدنی سے بڑھنے نہ پائے۔ چنانچہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ "جب کبھی میں دیکھتا ہوں کہ خرچ آمدنی سے بڑھ گیا تو سائین چلا جاتا ہوں۔ وہ چونکہ دیہات ہے اس لئے بہت سی مدوں میں کفایت ہو جاتی ہے۔ اور جب کمی پوری ہو جاتی ہے تو پٹنہ چلا آتا ہوں۔" بڑی بڑی مدوں کا خرچ اور حساب اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور متفرقات کا خرچ و حساب پٹنہ میں خانساماں اور سائین میں مختار و کارپرداز کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ خانساماں کا حساب اکثر روزانہ جانچ کر اس پر دستخط کر دیا کرتے تھے اور جب ناگزیر موانع پیش آجایا کرتے تو فرصت ملتے ہی اور ضروری کاموں کی طرح اس کو بھی انجام دیئے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ اور سائین کا حساب بھی اپنے اپنے موقعہ پر ضرور دیکھا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے صحبت یافتہ ایک بزرگ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے تھے کہ قاضی صاحب کو تپ تھی۔ خود پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور اُن کے پاس ہی فرش پر بیٹھا ہوا ان کا متصدی اُن کے خانساماں سے حساب سمجھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب عیادت کو آئے قاضی صاحب ان سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور حساب کی طرف بھی اُن کا دھیان تھا۔ مولوی صاحب نے اس حساب کتاب کی نسبت کہا کہ اس وقت اس بکھیڑے کو دفع کیجئے۔ قاضی صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اور علیٰ حالہ حساب ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے پھر کہا تو قاضی صاحب نے اُن سے کہا کہ میں اس قدر مستعدی سے حساب کی جانچ اس لئے کیا کرتا ہوں کہ ان کو (خانساماں کی طرف اشارہ کر کے) کبھی موقع نہ ملے اور خود میں کاہل نہ ہو جاؤں۔

دیانت دار و خائن ملازم کے بارہ میں ان کا قول تھا کہ نگرانی کی سستی اور اس میں کاہلی و غفلت سے اکثر اوقات آقا کو دیانت دار اور خائن دونوں قسم کے ملازموں سے یکساں نقصان

پہونچتا ہے۔ خائن نوکر آقا کے مال پر تصرف کرکے دوسری مدوں میں درج کر دیتا اور اپنی خیانت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دیانت دار صاحب اس کو اپنے تصرف میں لاکر لکھ دیتے اور پوچھنے پر کہتے ہیں کہ مجھے ضرورت تھی میں نے یہ رقم اپنی ذات میں خرچ کی ہے۔ آقا کو تو دونوں ہی سے نقصان پہنچا۔ اور غور کرکے دیکھو تو بے اجازت اپنی ذات میں خرچ کر لینا بھی بددیانتی ہے جس کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔

حساب جو جو اور بخشش سو سو پران کا پورا عمل تھا۔ اُن کے عزیزوں، دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں سے اگر کوئی شخص اُن سے قرض لیتا تھا تو اس کا سخت خیال رکھتے تھے۔ اور قرضہ کی رقم چاہے کسی قدر چھوٹی ہو جب واپس ہوتی تھی تو لے لیتے تھے اور اگر کسی نے خلاف وعدگی کی یا کوئی رقم دستگرداں کی ادا نہیں کی اور دوسری مرتبہ پھر مانگنے جاتا تو وہ صاف کہدیتے تھے کہ خود تمہارے فعل کی وجہ سے میں مجبور ہوں۔ اور جس شخص کا جیسا اعتبار اور اُس کی جیسی حیثیت ہوتی تھی اُسی کے تناسب سے وہ اُس کو قرض دیتے تھے۔ اور علیٰ ہذا جس شخص کی نادہندی کا تجربہ ہو جاتا تھا چاہے وہ عزیز و قریب و دوست کیوں نہ ہو اُس کو پھر کبھی قرض نہیں دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ اُس کے دوسرے تعلقات اور برتاؤ میں مطلق فرق نہیں کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک عزیز دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ لین دین کے تذکرہ میں ایک مرتبہ قاضی صاحب نے اُن کے سامنے کہا کہ اگر مجھ سے ملنے والے جھوٹے وعدے نہ کریں تو خواجہ کلاں گھاٹ کے حلقہ کے لوگوں کو کبھی سود دینے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔ میرے پاس اس کثرت سے لوگوں کی امانتیں رہتی ہیں کہ میں ایک کا کام دوسرے کے روپیہ سے نکال دوں بشرطیکہ وہ وعدہ کے مطابق ادا کر دیا کریں تاکہ ہر امانت اپنے وقت پر ادا ہو سکے۔

شاہ عبدالوحید صاحب راوی ہیں کہ قاضی صاحب نے اُن سے کہا کہ جس کسی سے قرضہ لو تو اُس کو جس طرح سے ہو سکے وقت پر ضرور ادا کر دو۔ اگر وقت معینہ پر روپیہ فراہم نہ ہو سکے تو قرض لیکر چیز بیچ کر جس طرح ہو سکے وقت پر ادا ضرور کر دو۔ اس سے ساکھ بنی رہے گی۔ اور اُسی دن یا

دوسرے دن پھر اُس سے قرض مانگو گے تو وہ دیدے گا انکار نہ کرے گا انکار کی کوئی وجہ نہ ہو گی ادائے قرض میں وعدہ خلافی کبھی نہ کرو ورنہ دوبارہ وہ شخص تم کو کبھی قرض نہ دیگا۔

امانت اُن کے اعزہ واقربا دوست واحباب کی کثرت سے امانتیں ان کے پاس رہتی تھیں۔ اور وہ پوری طرح امانت کا حق ادا کرتے تھے۔ چنانچہ گہری خصوصیت والوں میں سے ایک بی بی نے کچھ زیور قاضی صاحب کے پاس امانت رکھا اور کہا کہ جب مجھے ان کی ضرورت ہو گی لے لونگی ایک عرصہ کے بعد ان کے میاں نے آکر قاضی صاحب سے وہ زیور مانگے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ میں تم کو نہ دونگا اس لئے کہ تم نے امانت نہیں رکھے ہیں اور نہ امانت رکھتے وقت مجھ سے یہ کہا گیا تھا کہ میں اُن کے سوا کسی اور کے حوالہ کروں۔ اس پر وہ صاحب چلے گئے اور باوجود سخت خصوصیت کے قاضی صاحب سے صاحب سلامت ترک کر دی۔ پہلے تو قاضی صاحب کو اس کا گمان بھی نہ ہوا کیونکہ وہ اپنے حسن ظن سے اُن کو بھی اپنا ہی سا صاف دل وصاف خیال سمجھتے تھے۔ لیکن جب قاضی صاحب کے نزدیک اُن کی رنجش پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی تو موقع ملتے ہی قاضی صاحب علی الرغم اُن کے ان سے ملے اور اسی بے تکلفی کے ساتھ جو اُن کے ساتھ تھی اُن سے خطاب کیا اور کہا کہ تمہارے آزردہ ہونے کا باعث شاید یہ ہے کہ تم نے خیال کیا ہو گا کہ میں نے تم کو بد دیانت سمجھا اور میرے نزدیک تمہارا اعتبار نہیں ہے۔ لیکن میں بحلف کہتا ہوں کہ میں تم کو دیانت دار بھی سمجھتا ہوں اور قابل اعتبار بھی۔ رہا زیور کا نہ دینا اس کی وجہ صرف اسی قدر تھی کہ تم نے میرے پاس امانت نہیں رکھا تھا اور میرا فرض تھا کہ جس شخص نے امانت رکھا تھا اُسی کو واپس کروں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کے ایک قدیم دوست کے نوجوان لڑکے نے اپنے والد ماجد کے قضا کر جانے کی وجہ سے قاضی صاحب کو اپنی جائداد کا منتظم و منیجر بنایا تھا۔ اُس کا سارا حساب کتاب قاضی صاحب کے پاس رہتا۔ جو آمدنی آتی وہ براہ راست اُن کے ہی پاس جمع ہوتی اور اخراجات کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی وہ بھی اُن ہی کے یہاں سے منگوالی جاتی۔

اس نوجوان سعادتمند لڑکے کی شادی درپیش تھی۔ اُن کی والدہ نے اُن سے کہا کہ فلاں کام کے لئے

سو روپیہ مجھے قاضی صاحب کے یہاں سے منگوا دو۔ اُس لڑکے نے اس وجہ سے کہ وہ کام محض فضول ولایعنی تھا روپیہ منگوانے سے انکار کیا۔ تب اُن کی والدہ نے اُن کے خالو سے جو ایک معزز و سنجیدہ شخص کے منتخب لوگوں اور قاضی صاحب کے دوستوں میں سے تھے کہا کہ قاضی صاحب کو میری طرف سے جا کر کہئے کہ منجملہ مصارف شادی کے سو روپیہ بھیجد یجئے۔ قاضی صاحب نے یہ خیال کرکے کہ خلاف معمول یہ درخواست بلا توسط اُس لڑکے کے ہے اُن کو وہ روپے نہیں دئے۔ اور اُن سے بعنوان شائستہ کہدیا کہ اُسی لڑکے کو بھیجد یجئے وہ لے جائے گا۔ چنانچہ جب وہ گئے اور اُنہوں نے کہا کہ میں نے بہ فضول سمجھ کر اپنی والدہ سے کہدیا تھا کہ ایسے لغو کام کے لئے میں قاضی صاحب سے روپیہ مانگنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ تب اُنہوں نے یہ تدبیر اختیار کی۔ قاضی صاحب نے اپنے نوجوان دوست کو سمجھایا کہ بیشک یہ مد فضول اور لغو ہے لیکن دو وجہوں سے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم یہ سو روپیہ اپنی والدہ کو دے ہی دو۔ ایک تو تم عورتوں کے مزاج کو جانتے ہو تمہارے روکنے سے وہ ہرگز نہ رکیں گی۔ تم روپیہ نہ دوگے تو وہ قرض لیں گی یا کوئی چیز بیچ ڈالیں گی جس کا نقصان حقیقت میں تم ہی پر عائد ہوگا۔ اور دوسرے اُن کو ناخوش کرنے کی معصیت میں تم پڑتے ہو۔ اس سعید نوجوان کی سمجھ میں بھی بات آگئی اور اُس نے خود لیجا کر اپنی والدہ کو سو روپیہ دیدئے۔

دیانت

ایک مرتبہ عدالت کی گواہی کا تذکرہ آیا تو فرمانے لگے کہ سچے دیانت دار شخص کو کوئی آدمی اس زمانہ کی عدالتی کارروائی میں گواہ رکھ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ سچا دیانت دار آدمی بلا رو رعایت اور بغیر لحاظ اس بات کے کہ کسی کا نفع ہوگا یا نقصان جو کچھ اس کو معلوم ہوگا کہدیگا اور ہرگز اُن کے تراشیدہ عنوان مقدمہ کے ڈھرے پر نہ چلے گا۔ اسی لئے مجھے کوئی بھی گواہ قرار نہیں دیتا کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ بعض آدمی میرے پاس آئے اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ فلاں معاملت سے آپ واقف ہیں میں آپ کو گواہ رکھوں گا۔ میں نے اُن سے کہدیا کہ میں کسی کی بھی رعایت نہ کرونگا اور جو کچھ صحیح واقعہ مجھے معلوم ہے سب بلا کم و کاست کہدوں گا۔ اب اس میں چاہے کسی کا نفع ہو یا نقصان۔ میرے اس بیان کو جو شخص سنکر گیا وہ پھر کبھی اُس معاملہ کے متعلق دوبارہ نہیں آیا۔ یہ

تو اُن کا اصول اور اُن کی تعلیم تھی - اس کے متعلق مجھے معتبر اور شرعی عادل دوستوں سے جو دو واقع معلوم ہوئے اُن کو عملی ثبوت کی حیثیت سے یہاں تمثیلاً درج کرتا ہوں :

اخیر زمانہ میں قاضی صاحب کے ایک رشتہ دار پر خون کا مقدمہ پڑا۔ اُنہوں نے قاضی صاحب کا نام بھی گواہوں میں لکھوا دیا۔ لیکن قاضی صاحب نے بے غل و غش گواہی دی جس سے اُن کو نقصان پہنچا اور اُنہوں نے قاضی صاحب سے اس کی شکایت کی۔ قاضی صاحب نے اُن سے کہا کہ میں اپنی دیانت سے مجبور تھا۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ قاضی صاحب کے سامنے ایک معاملہ پیش ہوا۔ قاضی صاحب کے ایک قریب کے رشتہ دار اُن کے ایک دوست کے ٹھیکہ دار تھے۔ وا صلباقی کے وقت سو پچاس کی ایک رقم کی نسبت دونوں میں اختلاف ہوا۔ ٹھیکہ دار کہتے تھے کہ میں نے وہ رقم بھیجی ہے اور اگرچہ اُس کی رسید میرے پاس موجود نہیں ہے لیکن وہ شخص موجود ہے جس کی معرفت میں نے روپیہ بھیجا تھا۔ اور اہل معاملہ کہتے تھے کہ نہ وہ رقم مجھے ملی ہے اور نہ میرے سیاہہ میں درج ہے۔ قاضی صاحب کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا اور اس شخص نے جس کی معرفت رقم بھیجنے کا بیان تھا حرف حرف اُسی بیان کے مطابق جو ٹھیکہ دار صاحب کا تھا اظہار دیا۔ جب وہ کہہ چکا تو قاضی صاحب نے ایک دفعہ نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور غصہ کی صورت بنا کر اُس کو ڈانٹا کہ "مردود کیوں جھوٹ بولتا ہے سچ کیوں نہیں کہتا"۔ اس کا اُس گنوار نیچ قوم کے آدمی پر ایسا اثر ہوا کہ اُس کے اوسان خطا ہو گئے اور بے اختیار کہہ اُٹھا کہ میں کیا کروں جیسا مجکو سکھا یا گیا تھا میں نے کہہ دیا۔

ایک مرتبہ شب کے وقت میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس زمانہ میں میونسپلٹی کے ممبروں کا انتخاب درپیش تھا۔ قاضی صاحب سے اُسی کے متعلق دیر تک تذکرہ رہ چکا تھا اُس میں ایک خاص شخص کا ذکر بھی شامل تھا جو چند باوقعت و ذی اقتدار لوگوں کو ساتھ لیکر اپنے لئے قبل از وقت ووٹ لکھاتے پھرتے تھے۔ قاضی صاحب کی رائے اُن کے بارہ میں اچھی نہ تھی۔ کوئی آٹھ نو شب کے بج چکے تھے کہ یہ لوگ یہاں بھی آ پہونچے اور ووٹ کا کاغذ پیش کر کے دستخط کے خواستگار ہوئے۔ باوجودیکہ بزرگانہ

بزرگانہ وعزیزانہ تھا، قاضی صاحب اُن کو عزیزانہ نظر سے دیکھتے تھے لیکن اُس وقت قاضی صاحب کا استقلال اور سچی دیانت کا پاس دیکھنے کے قابل تھا۔ ہزار طرح سے ان لوگوں نے اپنی قوت بیانی وطلاقت لسانی کا زور خرچ کیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک سمجھانے بجھانے ارادہ سے ہٹانے اور اپنے دام میں لانے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا مگر یہاں تو دیانت دمتانت کا ایک کوہ تھا جس کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ ان لوگوں کے مایوس ہوکر چلے جانے کے بعد میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ اس وقت تو آپ نے کمال ہی کر دیا مافوق العادت استقلال سے کام لیا۔ یہ دلی دیانت کی قوت تھی جو مستقل رہی

صاحب کلکٹر ومجسٹریٹ پٹنہ کے اجلاس میں بہت دنوں سے ایک مسلمان خاندان کا مقدمہ تھا صاحب موصوف نے اپنی نیک دلی وترحم سے فریقین مقدمہ کی تباہی وبربادی کا خیال کر کے اُن سے کہا کہ اگر تم دونوں آپس میں مصالحہ نہیں کرسکتے تو دونوں ملکر کسی کو ثالث مقرر کرلو اور اُس سے اسکا تصفیہ کرالو ورنہ مقدمہ بازی میں دونوں تباہ وبرباد ہو جاؤ گے۔ فریقین نے کہا کہ کس کو ثالث مقرر کریں لوگوں میں اصلی دیانت وامانت عنقا ہے۔ کوئی دباؤ سے دب جاتا ہے کوئی سعی وسفارش پر کاربند ہوتا ہے۔ صاحب کلکٹر نے کہا کہ میں تم کو ایک نہایت ہی دیانت دار اور بے لوث آدمی بتاتا ہوں فریقین نے پوچھا کہ وہ کون ؟ صاحب کلکٹر نے کہا کہ قاضی رضا حسین۔ یہ نام سنتے ہی سب نے آمنا وصدقنا کہا اور فوراً راضی ہوگئے۔ وہ مقدمہ اُسی وقت بحیثیت ثالثی قاضی صاحب کے پاس منتقل کیا گیا۔ ثالثی سے فیصلہ ہوا۔ دونوں راضی ہوئے۔ اور دونوں تباہی سے بچ گئے۔

رحم انصاف ایک مرتبہ میں بانکے پور سے ملنے کو پہنچا تو فرمایا کہ تعزیرات ہند میں سرقہ کی کیا سزا لکھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ صرف قید یا قید وجرمانہ دونوں۔ فرمایا کہ ذرا پھر غور سے دیکھئے صرف جرمانہ بھی اُس کی سزا ہوسکتی ہے یا نہیں۔ میں نے پھر اُس کو پڑھ کر وہی عرض کیا جو پہلے عرض کرچکا تھا۔ فرمانے لگے کہ کیا مشکل کا مقام ہے۔ ایک ایسا مقدمہ میرے اجلاس میں آیا ہے جس میں ایک بیچارہ شریف حافظ ماخوذ ہے اور دراصل وہ سرقہ جس کو چوری ہم لوگ سمجھتے ہیں نہیں ہے لیکن قانونی تعریف سرقہ کی اُس پر صاف صادق آتی ہے اور اصل واقعہ ثابت ہے۔ اگر

اس میں صرف سزائے جرمانہ ہوتی تو خوب تھا۔ میرا دل اُس غریب کو سزائے سرقہ دینے کو نہیں چاہتا
مگر قانون کو کیا کیا جائے سخت افسوس و پریشانی کا مقام ہے۔

بعدہٗ معتبر لوگوں سے جو اجلاس پر موجود تھے مجھے معلوم ہوا کہ جس وقت وہ غریب حافظ
کٹھرے میں لاکر کھڑا کیا گیا اور قاضی صاحب نے فیصلہ لکھنا شروع کیا تو قاضی صاحب کی آنکھوں
سے برابر آنسو جاری تھے۔ فیصلہ بھی لکھتے جاتے تھے اور رومال سے آنسو بھی پونچھتے جاتے تھے۔ اور
فیصلہ سناتے وقت بھی اُن کی یہی حالت تھی آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ آخر اُس غریب کو شاید ایک دن کی
سزائے قید دی اس لئے کہ شے مسروقہ کچھ ایسی مالیت کی چیز نہ تھی۔

تحمل ایک روز اول وقت میں اور میرے دوست مولوی سید رحیم الدین صاحب بڑے کمرہ میں
(جس کو اُنہوں نے ڈرائنگ روم بنایا اور اسی طرز پر سجایا تھا) قاضی صاحب کے پاس
بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک سفید پوش سائل آیا۔ قاضی صاحب نے حکم دیا کہ اس کو دو آنے دے
دئے جائیں۔ چنانچہ خانساماں نے وہیں لاکر اس کو دیدئے۔ اس پر وہ سائل بہت بگڑا اور سامنے کھڑے
ہوکر بہت سخت و سُست کہنا شروع کیا کہ مجھے اور میرے دوست کو اس قدر غصہ آیا کہ ہم دونوں کانپنے
لگے۔ مگر قاضی صاحب کی یہ حالت تھی کہ بیٹھے مُسکرا رہے تھے اور فرمایا تو یہ فرمایا کہ بس جاؤ میں تو اسی
قدر دیتا ہوں۔ واقعی یہ تحمل و ضبط اُنھیں کا کام تھا۔ خانساماں، خدمتگار اور پیادے وغیرہ سب
موجود تھے اور معاملہ محض خیرات کا تھا۔

یہ تو چھوٹا واقعہ تھا۔ اُن کے تحمل و رحم و انصاف کا ایک ایسا سخت امتحان ہوا جس میں بڑے
بڑے لوگوں کے قدم ڈگ جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جہاں گنج بنچ میں بر سر اجلاس ایک بدمعاش نے اُن
پر جوتا پھینکا۔ وہ جوتا پنکھے میں لگا اور وہ شخص فوراً گرفتار ہوا۔ اُس وقت اُس نے نہایت ہی اشتعال
دلانے والے اور سخت ہتک آمیز کلمات رو در رو قاضی صاحب کی نسبت استعمال کئے۔ قاضی صاحب
نے غیر معمولی اور مافوق العادت ضبط و تحمل سے کام لیا اور جیسا کہ مجموعہ ضابطہ فوجداری میں مجسٹریٹ
کو اختیار ہے فوراً اُس کا مقدمہ تجویز نہیں کیا۔ قاضی صاحب کے ایک مخلص بے ریا دوست نے جن کو

میں علاوہ عالم و فاضل متقی و پرہیزگار ہونے کے بیس پچیس برس کے تجربہ سے بہت سچا آدمی جانتا ہوں مجھ سے بیان کیا ۔ یہ خبر سنکر میں اظہار افسوس و ہمدردی کے لئے اُن کے پاس حاضر ہوا۔ اور اس ناگوار واقعہ کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں اُنہوں نے معمولی خندہ روئی و بشاشت کے ساتھ کہا کہ آپ نے مثل نہیں سُنی ہے کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ۔ اگر واقع میں مجھ سے کوئی ایسا فعل خلاف دیانت، امانت، ایمان و انصاف سرزد ہوتا تو میری عزت اسی وقت جا چکی تھی گو یہ شخص جوتا نہ پھینکتا ۔ اور اگر میں نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا ہے تو میری عزت اُس کے ہاتھ میں تھی نہیں کہ چلی جاتی پھر فرمایا کہ چونکہ میں آج اپنے دل میں اس کا فیصلہ نہ کرسکا کہ آیا میں اُس کو اس لئے سزا دینا چاہتا ہوں کہ اُس نے ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی عدالت کی توہین کی ہے یا اس لئے کہ "رضا حسین" کی اور اس میں میرا نفس کس قدر شریک ہے اس وجہ سے میں نے مقدمہ کو ملتوی کر دیا ۔ آخر قاضی صاحب نے اس کا فیصلہ نہیں کیا جس کا باعث یہ ہوا کہ صاحب مجسٹریٹ ضلع کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے کہا کہ قاضی صاحب بڑے رحم دل ہیں اس کو سزا نہیں دیں گے اور مقدمہ کو اپنے اجلاس میں منگوا لیا۔

صلح جوئی مقدمہ لڑنے کو وہ نہایت ناپسند کرتے تھے ۔ ان کا قول تھا کہ اگر کوئی مجھ پر مقدمہ دائر کرے اور مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ وہ برسر ناحق اور میں برسر حق ہوں تب بھی بجائے اس کے کہ میں اس سے مقدمہ لڑوں اُس قدر روپیہ جو اُس سے لڑنے میں خرچ کروں اُسی کو دیکر اپنا پیچھا کیوں نہ چھڑاؤں ۔ اور چونکہ وہ سچے دیانت دار، انصاف پسند و انصاف شعار تھے اس لئے کسی کی ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی کہ اُن پر کوئی جھوٹا مقدمہ دائر کرے ۔ وہ فرماتے کہ لڑائی کے اسباب و وجوہ کو حضرت سعدیؒ نے کیا خوب اصولی طور پر بیان کر دیا ہے :

دو عاقل را نباشد کین و پیکار ۔۔۔ نہ دانائے ستیزد با سبکسار
اگر ناداں زجہلش سخت گوید ۔۔۔ ہنرمندش بنرمی دل بجوید
دگر در ہر دو جانب جاہلانند ۔۔۔ اگر زنجیر باشد بگسلانند

شاید بعض لوگ جن کو قانونی دنیا کا پورا تجربہ نہیں ہے یہ کہیں کہ قاضی صاحب کا یہ اصول کہ برسر حق ہونے کی صورت میں بھی میں روپیہ دیکر مقدمہ بازی سے رہائی حاصل کر لوں کچھ پختہ اور صحیح اصول نہیں ہے، اگر بے ایمانوں اور بدمعاشوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص اس اصول کا پابند ہے تو وہ ہمیشہ چھوٹی نزاعیں برپا کر کے اُس سے روپیہ اینٹھنے کی فکر میں رہیں۔ لیکن جھوٹی نزاعوں اور ناحق کی لڑائیوں کے لیے بھی کسی نہ کسی بنیاد کا گو وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو ہونا ضرور ہے۔ اور بے لگاؤ و بے تعلق اشخاص کے لیے ایسی بنیاد کا ہاتھ آنا قریب قریب ناممکن کے ہے۔ بالفرض اگر ایسی صورت آسان اور ممکن بھی ہو تو میں کہوں گا کہ جہاں اس کا احتمال ہو گا کہ محض جھوٹ اور ناحق لوگ دق کرتے ہیں وہاں اس کے سدّباب کے لیے کسی عاقلانہ تدبیر کے اختیار کرنے کی ممانعت تو نہیں ہے۔ اُن کا اصول جس خرابی و بربادی کی تصویر کھینچتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانونی دنیا پر نظر دوڑائی جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ اس زمانہ میں مقدمہ لڑنے سے بدتر کوئی مصیبت نہیں ہے۔ جو شخص کامیاب ہوتا ہے اُس کو ایک جھنجھی نہیں ملتی اور جو ناکام رہتا ہے وہ عمر بھر کے لیے تباہ برباد ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ کسی شخص کا ایک سو روپیہ واقعی و اصلی قرضہ کسی کے ذمہ ہو اور مصدقہ رجسٹری تمسک کے ذریعہ سے محفوظ بھی ہو اور مدیون کی نادہندی کے باعث اور بخوف تمادی نالش دائر کرنا پڑے تو کورٹ فیس، محنتانہ وکیل، طلبانہ احکام، خوراک، و طلبانہ گواہان، اخراجات تبدیلی تاریخ، اجرت نقل فیصلہ و ڈگری، جائز اخراجات کے علاوہ قدم قدم پر ناجائز اخراجات کی ٹھوکریں، وکیلوں کی دربانداری وخوشامد۔ کچہری کی حیرانی و پریشانی جو نامن حشر کی پریشانی سے بھی کچھ سوا ہی ہے۔ ان سارے مصائب کو نظر انداز کر کے بھی اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ پہلے ہی مرافعہ میں کامیاب فریق کو ایک حبہ نہیں ملتا۔ وائے بر حال اُن مقدمات کے جن میں دو یا تین مرافعہ کی نوبت پہونچے۔ بڑے بڑے خاندانوں کو لوگوں نے اس زمانہ کی ناپاک مقدمہ بازی کے پیچھے برای العین تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔

اسی نفرت کے ثبوت میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب قاضی صاحب نے اپنا ایک گاؤں تعلیم

کے لئے وقف کیا تو پٹنہ کے صاحب کلکٹر نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ گانوں اس لئے وقف کرکے سرکار کی تولیت میں دیا ہے کہ وہاں کی رعایا سرکش ہے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ اتنے عرصہ سے آپ اس ضلع کے کلکٹر ہیں کبھی بھی آپ کے اجلاس میں کوئی مقدمہ فوجداری یا مال کا رعایا بنام ضامن حسین یا رضا حسین بنام رعایا دائر ہوا ہے۔ صاحب کلکٹر نے کہا کہ نہیں۔

مقدمہ لڑنا تو قاضی صاحب کی فطرت ہی میں نہ تھا وہ اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ خود تو کیا لڑتے لڑنے والوں کو ملا دیتے اور تصفیہ کرا دیتے تھے دا صلحوا بینکم کے وہ پورے پابند تھے۔

ایک دفعہ قاضی صاحب کے ایک قدیم دوست کے لڑکے نے آکر بیان کیا کہ ایک زمین جو میرے مکان سے ملحق اور میری ہی ملکیت ہے میرے ایک عزیز نے مکان بنوایا تھا اس لئے عملا ان کا ہے اور زمین میری۔ صاحب مکان ایک بیوی اور ایک بیوہ بہن کو چھوڑ کر قضا کر گئے۔ نند بھاوج میں سخت ناچاقی ہے۔ بھاوج تو اپنے میکہ میں جا کر رہی ہیں لیکن اُن کے باپ بھائی اس مکان کے بارے میں ان کی نند سے جھگڑ رہے ہیں اور بیچاری نند باوجود اس کے کہ پہلے تقریباً دو ڈھائی سو روپیہ قیمت مکان کی بابت اپنی بھاوج کو دے بھی چکی ہے اور بقیہ قیمت ادا کر دینے کو آمادہ ہے۔ لیکن بھاوج کے لوگ اُس کو مکان نہیں دیتے اور اُس کے ساتھ میری زمین بھی ہضم کئے لیتے ہیں۔ اس قصہ کو سنکر قاضی صاحب ایک روز خود اُس عورت کے میکہ پہونچے اور اُس کو اور اُس کے باپ بھائی وغیرہ کو سمجھا کر اس عورت کی نند کے نام سے مکان متنازعہ فیہ کو خرید ا اور پورا زرثمن اپنے پاس سے دیکر رجسٹری سے بیع لکھوالی۔ جب وثیقہ بیع قاضی صاحب کو مل گیا تو اُس لڑکے کے ہاتھ نند صاحبہ کے پاس بھجوا دیا اور اس سہولت کے ساتھ مکان کا اور اُس لڑکے کی زمین کا سارا قضیہ چکا دیا کہ ہر فریق کو حیرت ہوئی اور اگرچہ قاضی صاحب نے اپنا روپیہ طلب نہیں کیا لیکن مشتریہ نے خود یہ خیال کرکے کہ جب انہوں نے ایسی عنایت و مہربانی کی ہے تو روپیہ واپس نہ کرنا سخت بے حمیتی ہے وہ زرثمن قاضی صاحب کو ادا کر دیا۔

جیسا کہ اہل اللہ اور محبان بنی نوع انسان کو دیکھا گیا ہے قاضی صاحب کو بھی لوگوں کے آپس میں صلح کرا دینے کا خاص مادہ تھا۔ جہاں اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کی قرابت اُن کے احباب

اُن سے ملنے والوں میں سے دو شخص کے آپس میں کسی وجہ سے رنجش یا کسی قسم کا جھگڑا یا تنازع ہے
تو نہایت خلوص و خوبی و خوش اسلوبی سے فریقین کی بے غرضانہ خیر خواہی کے لئے دونوں کو ملا دینے
کی کوشش کرتے اور ذاتی وجاہت، راستگوئی اور سب سے بڑھ کر اپنے نفس کی عدم شرکت کے باعث
اکثر کامیاب ہوتے تھے۔ اس قسم کے کل واقعات کا احاطہ تو تقریباً ناممکن ہونے کے علاوہ غیر ضروری
بھی ہے۔ صرف دو تین واقعات درج کئے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

جب اخبار الپنچ بانکی پور اور شرف الاخبار بہار کے آپس میں شرمناک مباحثہ شروع ہوئی
تو چونکہ دونوں کے ایڈیٹر اور مضامین نگار وحامی قاضی صاحب کے دائرۂ تعارف ومصادقت
کے اندر داخل تھے اس لئے قاضی صاحب نے صرف دونوں کی تحریروں کو دیکھ کر بغیر کسی شخص کی
تحریک کے محض اپنی نیک نفسی سے پہلے الپنچ کے ایک شریک سے اپنے مکان پر خاص ملاقات میں فرمایا
کہ شرف الاخبار کے متعلق جیسی تحریریں چھپنا شروع ہوئی ہیں ہرگز آپ کے شان کے شایاں نہیں ہیں
ایسی تحریروں کو ہرگز چھاپنا نہیں چاہیئے۔ اس کے جواب میں اُس شخص نے کہا کہ مجھے اُن تحریروں کے
یک قلم موقوف کر دینے میں کوئی عذر نہیں ہے مگر شرف الاخبار نہیں مانتا۔ وہ لکھنا موقوف کرے تو
الپنچ بھی اس کے لئے تیار و آمادہ ہے۔ آپ ہی اس کا ذمہ لیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہرگز
ایک حرف بھی الپنچ میں نہیں چھپے گا۔ اس کو سُنکر قاضی صاحب نے سکوت فرمایا جس کی وجہ ظاہر تھی
کہ اس جھگڑے کے بعد سے اُس وقت تک شرف الاخبار کے ایڈیٹر سے جو بہار میں تھے ملاقات
نہیں ہوئی تھی اور اُنکا عندیہ معلوم نہ تھا۔ اس گفتگو کے چند ہی روز بعد حضرت مخدوم الملک مخدوم
شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ کے عرس کی تقریب سے قاضی صاحب بہار تشریف لیگئے
تو چونکہ زمانہ دراز میں اور تعلیم مسلمانان کے لئے معاش وقف کر دینے کے بعد وہاں تشریف لے گئے
تھے وہاں کے مسلمان رؤسا، امرا، اور اعیان واشراف نے جن میں ایڈیٹر ومالک شرف الاخبار
بھی شریک تھے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا۔ اور عام جلسہ و دعوت کے ذریعہ سے
اُن کا شکریہ ادا کیا۔ خان بہادر مولوی سید نشاط علی میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ و سب رجسٹرار و رئیس بہار کے

مکان پر قاضی صاحب کی دعوت ہوئی تو وہاں قاضی صاحب نے (جہاں اپنچ کے شرکاء مضامین
نگاروں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا) شرف الاخبار کے ایڈیٹر سے کہا کہ اپنچ کے خلاف میں جیسی
تحریریں آپ کے اخبار میں شائع ہوتی ہیں ان کا شائع ہونا بالکل نازیبا و ناپسندیدہ ہے۔ آیندہ سے
آپ ایسی تحریریں شائع نہ کریں تو بہت اچھا ہو۔ لیکن ایڈیٹر صاحب نے کچھ ایسی تقریر کی جس سے معلوم
ہوا کہ وہ صلح پر آمادہ نہیں ہیں اور اپنے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنچ والوں کو دبا لوں گا۔ اس پر قاضی
صاحب نے اُن کو سمجھایا کہ یہ خیال غلط ہے ؎ ایں خیال است و محال است و جنوں + با ایں ہمہ
قاضی صاحب جب پٹنہ واپس آئے تو شرکاء اپنچ سے ایک لفظ بھی بہار کی گفتگو کا اعادہ نہ کیا جیسا کہ
پٹنہ کی گفتگو کا بہار میں تذکرہ نہ کیا تھا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر سر سید کے ڈیپوٹیشن پر قاضی صاحب حیدرآباد تشریف لائے
تو ایک روز اس ناچیز سے کہا کہ چلو فلاں شخص سے مل آئیں۔ میں نے کہا کہ چند مہینوں سے میں نے اُن کے
یہاں کی آمد و رفت بالکل ترک کر دی اور اس کے وجوہ فلاں فلاں ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا
کہ جب کسی شخص کو آدمی پہچان لے اور اُس کو معلوم ہو جائے کہ اُس میں فلاں فلاں عیوب ہیں تو اُس
کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ اُس سے بالکل کنارہ کرے اور صاحب سلامت ترک کر دے۔ بلکہ اس کو چاہیے
کہ اپنے تجربہ سے فائدہ اُٹھائے اور اس طور پر اُس سے برتاؤ کرے اور بضرورت ملتا جلتا رہے
کہ اُس کے ضرر سے محفوظ رہے۔ مثلاً چھوٹا بچہ مٹھائی کے ٹکڑے اور انگارے میں کوئی فرق نہیں
جانتا اُس کے دسترس کے اندر اُن میں سے جو چیز آئے گی اُس کو بلا تکلف ہاتھ میں لے لیگا لیکن
جب آدمی صاحب شعور ہو جاتا ہے تو یہ نہیں کرتا کہ آگ سے دشمنی کرتا اور اس کو گھر سے نکال کر
پھینکدینا ہے۔ بلکہ مٹھائی سے مٹھائی کا کام لیتا ہے اور آگ سے آگ کا۔ کیونکہ آدمی اس طور
سے صاحب سلامت اور ملنا جلنا ترک کیا کرے تو شاید اس کو ایک آدمی بھی ایسا نہ مل سکے گا
جو تمام عیوب سے پاک ہو۔ اُن کی یہ تقریر میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں فوراً اُنکے ہمراہ چلنے کو بخوشی راضی ہو گیا
قاضی صاحب کے اک عزیز جو نوجوان رئیس تھے اکثر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اُن کو

بار ہا ایسا اتفاق ہوا کہ وہ گئے اور قاضی صاحب کا نوکر اُن کے سامنے بیٹھا بیٹھا حقہ پیتا رہا اُن
کو بڑا معلوم ہوا۔ ایک دن قاضی صاحب اُن کے قیام گاہ کے سامنے سے گذرے کیونکہ اُن کے عزیز
بھی اُسی مکان میں رہتے تھے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب آ رہے ہیں اُنھوں نے اپنے
نوکر کو حکم دیا کہ میرے فتح پیچ کی چلم اُتار کر اُن کے سامنے بیٹھا پیتا رہ۔ اور سلام نہ کرنا اس نے تعمیل کی
قاضی صاحب دیکھتے ہوئے چلے گئے اور اُنھوں نے سمجھا کہ بالضرور یہ میرے نوکر کے برتاؤ کا جواب
ہے۔ اُنھوں نے اپنے نوکروں کو بلا کر کہا کہ تم نے فلاں عزیز کے ساتھ کیوں شوخی کی آیندہ خبردار
ایسا نہ کرنا۔ یہ صرف مزاج میں صلح جوئی کا اقتضا تھا جو یوں جلوہ نما ہوا۔

احسان | جس پر احسان کرتے تھے اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا برتاؤ کرتے تھے کہ گویا اُسی نے اُن
پر احسان کیا ہے۔ جلوت کیا معنی خلوت میں بھی کبھی اپنے احسان کا ذکر صراحتہً اشارۃً
کنایتہً اُن کے ملنے والوں میں سے کسی نے اُن سے نہ سنا ہوگا۔ بلکہ جن لوگوں نے باوجود بہت
سے احسانات اور نیکیوں کے اُن کے ساتھ کافر نعمتی اور بے وفائی کی تھی اُن کے بارہ میں
بھی کبھی اپنی کسی نیکی اور بھلائی کا تذکرہ یا شکایت نہیں کرتے تھے۔ احیاناً اور لوگوں کی زبانی
اگر کسی دوست کو ایسے لوگوں میں سے کسی کا حال معلوم ہو جاتا اور وہ اُن سے پوچھتا تو وہ اس
کو نہایت خوبی کے ساتھ ٹال دیتے تھے لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ کا ان سے
بڑھ کر اور کون عامل ہو سکتا ہے۔ احسان کے بہت سے عنوان ہیں اور قاضی صاحب نے سبھی برت کر
دکھایا۔ مصیبت زدوں کے کام آنا اس میں بھی جو ہو سکا اپنی اصول کی نگہداشت کے ساتھ دریغ
نہ کیا۔ جس میں جو صفت پائی اس کی قدر کرنے اور موصوف کے سر بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہ کیا۔ جس میں کوئی عیب پایا اس کے دور کرنے میں بھی اُنھوں نے کچھ کم ہمت صرف نہیں کی ان کے
ذاتی اور قومی احسانوں کی فہرست کہاں تک دی جائے۔ بعض رئیسوں کا دستور تھا کہ اُن کے
یہاں میلی اور گرد آلود دری پر سفید جاجم بچھا ہوتا تھا۔ جاجم پر تو خود بیٹھتے تھے اور جو کوئی آیا اُن
کے لئے وہی میلی دری۔ اسی طرح اُن کا پیچوان تو خاص ہوتا تھا جو کسی طرف بڑھتا نہ تھا اور دوسروں

کے لئے وہی ذلیل تھے۔ اسی طرح گلوریوں میں خصوصیت تھی ہاں جو کوئی رئیس مقابل کا یا اُن سے بڑا آتا تھا وہ برابر کے برتاؤ کا مستحق ہوتا تھا۔ لیکن بڑوں کے سوا اُن کی شیخی اور غرور مساوات کو جائز ہی نہیں رکھتا تھا قاضی صاحب نے ان کی اصلاح کی اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اُن کی کایا ہی پلٹ دی اور اُن کے دل و دماغ میں وہ روشنی آئی کہ وہ اپنی اور قوم کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوئے۔

میں تو ہر ایک واقعہ کی نام بنام فہرست گناتا مگر ایک تو اس خیال سے کہ نام سے کیا کام اور دوسرے اس وجہ سے کہ احسان کا بوجھ جو بارگراں ہوتا ہے ممکن ہے کہ اب اُن کے خاندان والوں کو بُرا لگے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں اس لئے میں نے اجمالی بیان پر اکتفا کیا۔

صاف گوئی صاف گوئی اُن کی فطری خصوصیت تھی جس امر کو وہ اپنے اصول یا دیانت و امانت و کانشنس کے خلاف سمجھتے تھے۔ اُس پر زور دینے والا اور اصرار کرنے والا چاہے جو ہو وہ اُس سے صاف انکار کر دیتے تھے۔ اور اُن کی نیت یہ ہوتی تھی کہ اُس کے وجوہ و دلائل خوش اسلوبی سے اُس کے ذہن نشین کر دیں۔ اس کی سیکڑوں مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ پٹنہ کے ایک بڑے رئیس صاحب نے ایک متوسط درجہ کے آدمی سے کئی ہزار روپے کو ایک مکان خریدا تھا۔ زرثمن میں سے دو ہزار روپے باقی رہ گئے تھے۔ بائع نے جب اُس کی وصولی میں ٹال مٹول دیکھا اور اُن کو تمادی کا بھی اندیشہ ہوا تو اُنہوں نے عدالت دیوانی میں نالش دائر کرنے کا ارادہ کیا۔ مشتری صاحب نے یہ خبر پا کر بائع کو بلوا کر کہا کہ آپ نالش نہ کریں اس وقت میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے ایک مہینے کے اندر میں آپ کا زرثمن بے باق کر دوں گا بائع نے کہا کہ زبانی وعدے تو بارہا ہوئے اور وفا نہ ہوئے جس کی وجہ سے اس قدر عرصہ گذر گیا اور میں تنگ آ گیا۔ اگر آپ مجھے اس کا اطمینان کرا دیں تو یہ وعدہ پہلے وعدوں کا سا نہیں ہے تو میں ایک مہینہ کی اور مہلت دینے پر راضی ہوں۔ مشتری صاحب نے کہا کہ میں قاضی رضا حسین صاحب کی ضمانت دیتا ہوں اس سے تو آپ کو اطمینان کلی ہو جائے گا۔ بائع نے

نہایت خوشی سے اس تجویز پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور دونوں آدمی قاضی صاحب کے پاس پہونچے امیر صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ ان بائع صاحب کے مقابلہ میں آپ دو ہزار کی ضمانت میری کر لیجیے کہ میں ایک مہینہ میں ان کو یہ رقم ادا کر دوں گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مجھے آپ کا پورا اعتبار ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ ایک مہینہ میں نہ سہی دو تین مہینے میں دو ہزار روپے مجھے آپ سے وصول ہو جائیں گے۔ لیکن چونکہ خود میرے پاس دو ہزار روپے موجود نہیں ہیں۔ اور نہ مجھے توقع ہے کہ ایک مہینہ کے اندر یقینی طور پر دو ہزار روپیہ میرے پاس جمع ہو جائیں گے۔ اس لئے میں ضامن نہیں ہو سکتا۔ اگر مدت معینہ کے اندر آپ نے روپے نہیں دئے تو میں جھوٹا ہوا۔ پھر امیر صاحب نے ہزار اصرار کیا اور اُن کی باتوں سے رنجش کے آثار بھی نمایاں ہوئے مگر قاضی صاحب نے اپنا فیصلہ مسترد نہیں کیا۔

۱۸۹۱ء میں جوگیا میں ہندو اور مسلمانوں کا شرمناک مذہبی بلوہ ہوا اور اُس میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ اُس کے متعلق چونکہ قاضی صاحب کو اس وجہ سے کہ اُن کے بہت سے احباب و اقران وہاں اس وقت موجود تھے وہ سب واقعات اصلی و واقعی صحیح طور پر معلوم ہو گئے تھے جن پر پردہ ڈالا گیا تھا اور مسلمانوں کی بیکسی و بےبسی اور مظلومیت کی سچی داستانیں اُن کے پردۂ دل پر نقش تھیں۔ اس لئے جب وہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد اعلیٰ ترین مقامی حاکم صوبۂ بہار سے ملنے کو گئے تو اثنائے گفتگو میں اُس سے صاف کہا کہ خیر آپ لوگوں نے تو بیچارہ مظلوموں کی مطلق داد نہ دی اور فریاد نہ سُنی، اب ایک حاکم اور ہے جو اُن کی فریاد سُنے گا اور ظالم کی ہرگز طرفداری نہ کرے گا۔ اب وہ اُسی کے یہاں اپنا مرافعہ کریں گے۔ اُس نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ حاکم حقیقی ؎

اگر تو سے نہ دہی داد روز داد ہے ہست

اختلاف رائے

اختلاف رائے سے وہ کبھی ناراض نہ ہوتے جس کسی کی رائے اُن کی رائے کے بالکل متضاد و مخالف ہوتی اُس سے بھی نہ تو گفتگو میں اُن کی خندہ پیشانی

میں بل پڑتا نہ برتاؤ میں کچھ فرق آنے پاتا ۔ چنانچہ جس زمانہ میں سرسید کو میں کافر سمجھتا تھا اکثر بحث چھڑ جاتی تھی مگر قاضی صاحب کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں آنے پائی نہ گفتگو میں فرق آیا نہ برتاؤ میں۔ ان کے ہم سن اور ان کے اعزہ ہمیشہ رفع شکوک کے لئے مباحثہ کیا کرتے مگر ان کی نسبت احقاق حق کے سوا اور کچھ نہ ہوتی ۔

ایک مرتبہ جناب نواب ولایت علی خاں صاحب سی آئی ای رئیس اعظم پٹنہ سے کسی قومی کام کے متعلق اختلاف رائے ہوا۔ پرانے زمانہ کے لوگوں کا اختلاف صرف اختلاف رائے ہی تک محدود نہ ہوتا تھا بلکہ اس کا قدم آگے بڑھتا تھا اس پر خوشامدیوں کی رنگ آمیزیاں اسے گہرا ہی کرتی جاتی تھیں ۔ کسی خط کے جواب میں جناب نواب صاحب ممدوح کا خط آیا قاضی صاحب نے دیکھا کہ غلط بنا و غلط بیانی پر مجھ سے کشیدگی پیدا ہوئی تھی تو اس کا اثر قومی کاموں پر نہ پڑنا تھا اس لئے قاضی صاحب نے نہایت ولی سکون کے ساتھ بیس مقولے حکماء و فلاسفروں کے لکھے اور کوشش کی کہ ایک خط میں یہ مقولے سما جائیں اور کسی طرح یہ مفید باتیں نواب صاحب کے کانوں تک پہنچ جائیں تو موقعہ موقعہ پر یہ مقولے اپنا کام کرتے رہیں گے ۔ ایسا ہی کیا اور اس کا نتیجہ بھی مفید ہی ظاہر ہوا ۔

بچے، لڑکے، جوان سب ہی اختلاف کرتے اور آزادی کے ساتھ اختلاف کرنے اور اختلاف میں تیزی اور اظہار جوش میں بھی نہ چوکتے مگر قاضی صاحب ہمیشہ قول کو دیکھتے تھے قائل کو نہیں، غلطی دیکھتے تو ہمیشہ سمجھانے کا خوش گوار اسلوب اختیار کرتے اور کبھی دباؤ نہ ڈالتے ۔ پاک نفس بزرگوں کی روش اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے ۔

قاضی صاحب علیہ الرحمۃ کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے سبب سے لوگوں نے سید احمد خانی کونیچری سمجھا اور اپنی غلط فہمی اور ناواقفی سے معترض ہوئے ۔ ان میں علماء کے طبقے مولانا کمال صاحب مولوی حکیم عبدالحمید صاحب وغیرہ سے مباحثے بھی ہوتے رہے اور اختلاف آراء بھی رہا مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنے برتاؤ میں اپنے انداز میں ان حضرات کی بزرگداشت

میں ان کی محبت واخلاص میں کچھ بھی کمی کی۔

وہ رائے میں اختلاف کرتے تھے تو ہرگز ہرگز اس میں تعصب ونفسانیت اپنے انکسار اور دوسروں کے استحقار کو دخل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میونسپلٹی کی ایک میٹنگ میں قاضی صاحب نے ایک ایسے امیر ورئیس کی رائے سے اختلاف کیا جن سے اُن کے پرانے تعلقات اور گہرے روابط تھے اور جن کی قاضی صاحب دل سے وقعت وتنظیم کرتے تھے۔ اُن کو سخت ناگوار ہوا جس کو قاضی صاحب نے محسوس کیا۔ اس لئے قاضی صاحب نے اُن کے مکان پر جاکر مخلصانہ معذرت کی اور اُن کو یقین دلایا کہ اس اختلاف رائے کو ہمارے آپس کے تعلقات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ ایک رفاہ عام کا کام ہے جس کو ہم محض امانت دار کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔ اور جہاں تک کہ اس کام کا تعلق ہے ہماری ذاتی خصوصیات اور خانگی تعلقات کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔

تاثر ونصیحت پذیری اُن کی طبیعت غایت درجہ کی متاثر اور نصیحت پذیر واقع ہوئی تھی۔ جہاں کوئی بات اُن کی سمجھ میں آگئی تو پھر اُس پر نہایت مستعدی وسرگرمی سے عمل کرنے میں عام اہل دنیا کی طرح کوئی خیال باطل یا شرم بیجا اُن کے سدِ راہ نہ ہوتی تھی من استوٰی یوماہ فہو مغبون (جس شخص کے دُو دن یکساں رہیں وہ گھاٹے میں ہے) ان کا دستور العمل تھا۔ اور یہ حدیث میں نے پہلی پہل اُن کی ہی زبان سے سُنی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو روزانہ کچھ نہ کچھ نئی بات سیکھنا اور ہر روز ترقی کا قدم آگے بڑھانا چاہیے۔ یہ تو قول تھا اور عمل کا یہ حال تھا کہ اُنکی روزمرّہ کی زندگی کو غور سے دیکھنے والوں کو اُنکی صفت مذکورۂ بالا کا ہر جگہ سراغ ملتا اور اُن کے قول کی عملاً ہر جگہ تصدیق ہوتی تھی۔ خود اس کتاب کے بنیر سے واقعات سے جو مختلف پہلوؤں سے مختلف عنوانوں کے تحت میں درج ہیں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں بھی کم سے کم ایک ہی واقعہ سہی مثالاً اور شہادتاً بیان کر دینا کافی اور مناسب سمجھتا ہوں۔

مجھے معتبر اور سچّے لوگوں سے معلوم ہوا کہ اُن کا ایک ذی عزت اور مالدار رعیّت جو خاص اُن کے موضع میں رہتا اور زمینداری کے متعلق کسی جرم کا قصور وار تھا اُن کے سامنے آیا تو قاضی صاحب

اُس پر بہت برافروختہ ہوئے اور سخت وسُست کہکر نکلوا دیا۔ ہرچند اُس نے منت و سماجت کی مگر ایک نہ سُنی۔ جب یہ ڈومری کی طرف ہوکر پٹنہ جانے لگے تو کہا۔ اُن کی پالکی اُسی گاؤں میں ہوکر لے چلے جس میں اُس معتوب رعیت کا گھر تھا۔ قاضی صاحب حضرت امام غزالیؒ کی کتاب (شاید کیمیائے سعادت) دیکھتے جاتے تھے۔ جس وقت اُن کی پالکی اُس کے گھر کے نزدیک پہونچی تو حسن اتفاق سے اس مضمون پر پہونچے کہ "قیامت کے دن بندے جب خدا تعالےٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کریں گے تو اُن سے کہا جائیگا کہ تم نے ہمارے کتنے بندوں کے گناہ معاف کئے تھے جو مجھ سے اپنے گناہوں کی آمرزش کے خواہاں ہو" بس اس کے دیکھتے ہی فوراً پالکی رکھوادی اور اس رعیت کے گھر چلے گئے وہ اُن کی صورت دیکھتے ہی سہم گیا کہ ناخوش ہوکر تو نکال ہی چکے ہیں خدا جانے اب کیا قہر ڈھانے یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن قاضی صاحب نے فوراً اُس کا وسوسہ دور کر دیا اور کہا کہ میں نے تیرے سب قصور معاف کر دئیے۔ جس طرح کے تعلقات تھے سب اپنی حالت پر رہیں گے مجھے تجھ سے اب کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہ کہکر وہاں سے روانہ ہوئے۔

علم کی قدر

قاضی صاحب کے خاندانی خانہ زاد کا ایک بیٹا چھٹپن میں گھر چھوڑ کر باہر نکل گیا اور ایک عرصہ بعد ڈاکٹری پاس کر کے گھر واپس آیا۔ اُس کا بوڑھا دادا جو اُس زمانہ میں قاضی صاحب ہی کے یہاں سائیس تھا، پوتے کو لیکر سلام کرانے کو قاضی صاحب کے حضور میں حاضر ہوا قاضی صاحب کو اُس کے پڑھنے لکھنے کی حالت پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔ اس لئے اُس سے بغلگیر ہوئے۔ اور باوجودیکہ اُس کی ہمت وجراُت کسی طرح اجازت نہ دیتی تھی مگر اس کو اپنے برابر بیٹھا لیا۔ اور فرمایا کہ تو نے علم حاصل کیا تو میں تیری قدر نہ کروں تو کون کریگا۔

ایک ہونہار مسلمان لڑکا غیر ضلع سے انٹرینس میں اعلیٰ درجہ کا تمغہ اور وظیفہ حاصل کر کے پٹنہ کالج میں پڑھنے کو آیا قاضی صاحب کو اس کی ذہانت وطباعی اور شوق تحصیل علم کا حال معلوم ہوا وہ محض اسی وجہ سے خود اُس سے بانکے پور جاکر ملے اور اُس کے پورے دوست ومربی بن گئے اور جب اُس کے جذبات شوق علم کے سبب خدا نے اُس کے ولایت جانے کا سامان کر دیا تو جہتک

وہ ولایت میں رہا قاضی صاحب نہایت راز داری اور دلسوزی و دلی ہمدردی و عزیزانہ شفقت وعنایت کے ساتھ اس کے گھر کی خاموش کفالت کرتے رہتے۔ جب وہ ولایت سے واپس آیا تو جیسا کہ اُس نے چلتے وقت کہا تھا قاضی صاحب کے سب روپیہ واپس کر دئے۔ شاید بعض کم بین یہ خیال کریں کہ قاضی صاحب یہ روپے اُس سے واپس نہ لیتے تو بہت اچھا ہوتا لیکن جو لوگ قاضی صاحب کے اصول وطرز عمل سے پورے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ روپے واپس لینے سے اُن کا ورفوائد مدنظر تھے۔ ایک تو یہ کہ قوم کے افراد خصوصاً اُن لوگوں میں جن سے اس بدنصیب قوم کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں دست نگری کی عادت نہ پڑے اور ملت طلب یعنی اپنی مدد آپ کرنی اُن کی زندگی کا اصول ہو جائے۔ دوسرے یہ تو تعلیم کی منزل طے کر چکے اور ڈپٹی ہونے سے کامیابی کے رستے پر آچکے تھے اس روپیہ سے دوسروں کی جو آیندہ اس کٹھن منزل میں قدم رکھنے والے تھے مدد مدنظر تھی تاکہ قوم کو فائدہ پہنچتا رہے چنانچہ اسی اصول پر جب راقم کو اُنہوں نے علی گڑھ بھیجا تو صرف اُسی وقت تک کے لئے وظیفہ مقرر کیا جب تک کہ میں وہاں کا وظیفہ حاصل کر لوں چنانچہ جب میں چوتھے درجہ میں اوّل آیا اور مجھے پانچ روپیہ کا وظیفہ ملا تو انہوں نے موقوف کر دیا تاکہ اسکو بہترین مصرف کیا جائے

کلکتہ میں بعض لوگوں نے ایک بنگالی مسلمان کو جو اسی زمانہ میں اعلیٰ درجہ میں گریجوایٹ ہوا تھا اور جو کم عمر اور بہت ہی ہونہار تھا قاضی صاحب سے ملایا۔ قاضی صاحب نے حیدرآباد میں خود مجھ سے اُس گریجوایٹ کے متعلق باتیں بیان فرمائیں۔ قاضی صاحب کا دل جو قومی حالات سے بے حد متاثر ہو رہا تھا اور اس لئے جہاں امید کی ذری جھلک نظر آتی، اُن کا دل بیکل ہو جاتا۔ اس کو دیکھکر بہت خوش اور مسرور ہوئے لیکن اس کی یہ درخواست کہ وہ اپنے روپے سے اُسے ولایت بھیج دیں اس بنا پر نامنظور کی کہ سیکڑوں مستحقین محروم رہ جائیں گے۔ مگر اور ہر طرح سے اُس کی اعانت و دستگیری کی۔ اپنے ذاتی رسوخ سے اُس کو ڈپٹی مجسٹریٹ کے امتحان مقابلہ میں داخل کرایا۔ اور اس میں کامیابی کے بعد سفارشوں سے اُس کو بہت جلد پچاس روپے کی کارآموزی سے ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ دلا دیا۔

علم کی قدر دانی تو اس حد کو تھی کہ کوئی علمی جملہ کسی فلاسفر کا ہو یا کسی عالم کی زبان سے

جاہل کی زبان سے بوڑھے کی زبان سے بچے کی زبان سے مسلمان انگریز یا ہندو کی زبان سے نکلا اور قاضی صاحب کے دماغ میں جاگزیں ہوا تو وہ صفات متعدیہ کی طرح سے تمام پھیل جاتا تھا اور وہ خاص شرف حاصل کر لیتا تھا۔

ایک دفعہ برہمو سماج کے ایک بہت بڑے مشہور اسپیکر بانکے پور میں تشریف لائے قاضی صاحب نے انھیں مدعو کیا اور فرمانے لگے کہ ان کی قابلیت اور ان کی اسپیچ کا شہرہ تو ہے ہی اسی کے ساتھ اس کی بھی شہرت ہے کہ یہ ایسے خوش دل ہیں جن کی خوش دلی چہرہ اور زبان سے ٹپکی پڑتی ہے۔ برہمو سماج تو مسلمانوں کے ساتھ ہی کھاتے ہیں اس لئے اس دعوت میں اور بہت سے معززین شہر مدعو تھے۔ مہمان صاحب حسب وعدہ شام کو تشریف لائے۔ اور احباب کی صحبت گرم ہوئی۔ واعظ صاحب اپنی ڈیوٹی اور وعظ سے غافل تو تھے نہیں قاضی صاحب نے فرمایا کہ جب آپ خدا کو ایک اور سارے پیغمبروں کو مانتے ہیں تو پھر آپ سے اور ہم مسلمانوں سے فرق کہاں پر سے ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ سب پیغمبروں پر مضمون القا ہوتا تھا اور عبارت اُن کی اپنی ہوتی تھی۔ چونکہ عبارت انسانی ہوتی تھی اس لئے احتمال غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ ہم لوگوں نے اسی لئے ہر مذہب کی عمدہ عمدہ باتوں کو چن لیا ہے اور انھیں پر عمل کرتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ عمدہ عمدہ باتوں کو جو چنا ہے تو اپنی زبان میں یا کسی اور زبان میں؟ وہ چپ ہو گئے۔ صرف یہی ایک مہذب سوال تھا جو اُن کے مذہب کے بطلان کے لئے کافی تھا وہ فوراً سمجھ گئے اور پھر بجائے وعظ کے غور میں پڑ گئے لیکن قاضی صاحب نے پھر کچھ نہ کہا اور اُن کے علم و صفات کی قدر دانی میں کچھ فرو گزاشت نہ ہونے دیا۔

اصابت رائے

چھوٹے بڑے امیر و غریب ہر درجہ کے لوگ قاضی صاحب کو صائب الرائے اور معتقد سمجھتے اور رائے لینے کے لئے آیا کرتے تھے وہ سب کو رائے دیتے اور سب کے راز دار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ایک برات میں سائین پہونچا۔ قاضی صاحب کے بنگلہ میں برات اُتری۔ گرمیوں کا زمانہ تھا قاضی صاحب بنگلہ کے صحن میں پختہ چبوترہ پر تشریف رکھتے تھے معناً

نشست تھی۔ وہ اُس زمانہ میں رات کا کھانا بجائے مغرب کھایا کرتے تھے۔ مجھے باصرار کھانے میں شریک کیا اور فرمایا کہ تمہارے ساتھ اور بھی جو خاص لوگ ہوں اُن کو بھی بلوا لو میں نے اس کی تعمیل کی۔ اس ملاقات میں قابلِ ذکر یہ واقعہ ہے کہ دوسرے دن تخلیہ میں میں نے عرض کیا کہ ایک اہم امر میں مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ میں فلاں بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہوں اس بارہ میں آپ صلاح دیں اُن کی تعمیل کروں۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ تم کو ایک واقعہ سناتا ہوں " مکہ معظمہ میں ایک دن میں حرم شریف سے نکلا تھا کہ میرے ایک پیر بھائی جو چند سال پیشتر سے ہجرت کرکے وہاں مقیم تھے میرے پاس آئے اور چونکہ میری نسبت وہ حسن ظن رکھتے تھے کہنے لگے کہ رضا حسین! تم سے ایک ضروری امر میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا کہئے جو کچھ میری رائے ناقص میں آوے گا کہدوں گا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہاں مکہ معظمہ میں ایک بزرگ ہیں جن سے میں ارشاد لینا چاہتا ہوں میں نے کہا کہ آپ اُن سے ہرگز ارشاد نہ لیں اس لئے کہ جب آپ کو ایک تیسرے شخص سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ کا دل پورا اُن کی طرف مائل نہیں ہے اور آپ کو اس بارے میں تذبذب ہے حالانکہ بیعت کے لئے قلب کی ایسی یکسوئی و یکجہتی ہونی چاہئے کہ کسی سے مشورہ کرنا اور پوچھنا تو درکنار کسی کے منع کرنے پر بھی آدمی نہ رُکے۔ اصابت رائے کے لئے ذہن رسا اور فکر سلیم درکار ہے۔ ان کا ذہن و ذکا اور غور و فکر حیرت انگیز اور تعجب خیز تھی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ اُن کی تحصیل علمی میدنذی تک تھی اور ظاہر ہے کہ چونکہ اُن کے مشاغل کی جولانگاہ میدان درس و تدریس سے بالکل مخالف سمت میں واقع تھی اس لئے جو کتابیں اُنہوں نے پڑھی تھیں اُنہیں کے مسائل محفوظ ہونے کی توقع نہیں اور اوپر کے درجہ کی کتابوں کے مسائل پر عبور اور اُن پر فیصلہ کی کس طرح توقع ہو۔ باایں ہمہ ایک واقعہ سے میں متحیر ہو گیا۔ جب میں شرح سلّم مولوی حمد اللہ قیاس کی بحث پڑھتا تھا تو قاضی صاحب جیسا کہ اکثر مونڈی بازار کے مدرسہ میں مولانا امین اللہ صاحب کے پاس تشریف لایا کرتے تھے تشریف لائے اور میں چونکہ اُن سے بے تکلف ہو چکا تھا باتیں کرنے لگا۔ اثنائے گفتگو میں میں نے قاضی صاحب سے

کہا کہ قیاس سے نتیجہ نکلنے کے بارہ میں تین رائیں ہیں۔ ایک اشاعرہ کی۔ دوسری معتزلہ کی۔ تیسری حکما کی۔ پہلا گروہ کہتا ہے کہ عادتاً نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرا نتیجہ کی تولید کا قائل ہے۔ اور تیسرا لزوم کا۔ اور پھر میں نے ہر فرقہ کے دلائل و وجوہ بیان کئے۔ اور قاضی صاحب سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک صحیح اور عقل کے مطابق کس فرقہ کی رائے ہے۔ قاضی صاحب نے فوراً کہا کہ فرقہ حکماء کی۔ اور پھر اپنی اس رائے اور ترجیح کی بہت ہی عمدہ توجیہیں اور تمثیلیں بیان کیں۔ اور بقیہ دونوں فرقوں کے دلائل جو میں نے پیش کئے اُن کا ابطال بھی عمدہ طور سے کر دیا۔

چھٹا باب

قاضی صاحب کے خیالات و اعمال اور خانگی معاشرت

صوفیانہ رنگ قاضی صاحب جدید خیالات اور زمانہ کے رنگ سے بخوبی واقف تھے اگرچہ اُنہوں نے قدیم طرز کی مشرقی سوسائٹی میں تربیت پائی تھی، لیکن باایں ہمہ وہ متعصب و تنگ نظر نہ تھے، اور کورانہ تقلید پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے ہر مسئلہ پر اطمینان و فراخ دلی سے غور کرنے اور مفید باتوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے اُن کی زندگی ایک عملی زندگی تھی، جس چیز کو ایک دفعہ مفید سمجھ لیتے اُس پر صرف نہ خود عمل کرتے بلکہ دوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دیتے تھے،

اصلاحِ نفس و حُسنِ اعمال پر اُن کی خاص توجہ تھی، کوئی شخص محض معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینے سے انسان نہیں بنتا بلکہ ضرورت عمل کی ہے عزت کے لائق صرف وہی انسان ہیں جو اپنے روزمرہ کے اعمال اور سیرت و خصلت کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر ہیں۔ قاضی صاحب اس نکتہ کو سمجھتے تھے، اس لئے اپنے نفس و اعمال کے محاسبہ میں برابر مصروف رہتے تھے، اُنہوں نے

ذاتی سعی و کوشش سے درجہ بدرجہ ترقی کی مختلف منازل سے گزرے لیکن آخر میں تصوف کا رنگ اُن پر غالب آگیا۔

قاضی صاحب کی زندگی کا یہ انقلاب کوئی غیر معمولی بات نہیں، بڑے بڑے حکیم، فلسفی، ملحد اور مغرور و سرکش انسان زندگی کے تلخ ترین منازل سے گزر کر آخر کار اس کوچہ میں آئے جہاں ان کو اطمینان قلب نصیب ہوا، جو درحقیقت حاصل زندگی ہے۔

اس منزل میں عجز و نیاز ہے، خاکساری ہے، اپنے کو کامل انسان بنانا ہے لیکن بنانے سے پہلے پامال کرنا اور مٹانا ہے، صرف وہی لوگ اس راہ میں قدم رکھتے ہیں جو سعید و سلیم الفطرت ہیں، قاضی صاحب بھی خوش نصیبی سے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

خدا کا حکم تھا وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ۔ قاضی صاحب نے جب مانگی مراد حسب خواہ پیر و مرشد پا لیا، بیعت کرلی تو مجاہدہ میں قدم ڈالا۔ یہ تو اُن کی فطرت تھی کہ جس رنگ میں آئے ڈوب کر آئے مجاہدہ میں جب ور آئے تو زلفیں بڑھائیں اور حمائل شریف زیب گلو کی، دولت کے ساتھ یہ رنگ طلب و ہمت اور صدق و اخلاص کی بیّن شہادت تھی، اور یہی چاروں صفات ترقی کے عناصر ہیں صوم و صلوٰۃ کے وہ اس درجہ پابند تھے کہ کبھی نماز قضا نہ کرتے تھے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ اگر میں نماز کا پابند نہ ہوتا تو کافر ہو جاتا۔ ہر جمعہ کو پابندی کے ساتھ چاہے گرمی کی طپش کسی نمبر پر ہو یا ابر و باران کا زور کسی درجہ پر ہو وہ برابر شہر کی جمعہ مسجد میں جایا کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ اپنی وضع اور دوستی کے برتاؤ کے پابند تھے اس لئے بعد نماز جمعہ خواجہ محمد خلیل صاحب کے مکان پر جاکر اور کچھ دیر ٹھہر کر واپس ہوتے تھے۔ جس طرح وہ پوشیدہ تہجد گزار تھے جس سے خاص لوگوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہیں اسی طرح اُن کے ریاضات روحانی بھی اخلاقی ریاضات کے سوا نمایاں نہ ہوئے کہ عجب کے دریا کو رخنہ اندازی کی جگہ مل سکے۔ وہ روحانی تعلیم بھی کرتے تھے مگر پوشیدہ۔ میرے عزیز دوست حافظ عبد الحق صاحب نے مجھ سے اپنا ذاتی علم بیان کیا کہ مگرمی جناب ڈاکٹر صفدر حسین صاحب کو شراب سے

توبہ قاضی صاحب نے کرائی اور تصوف کی طرف ڈاکٹر صاحب کی گردن اُنہوں ہی نے جھکائی اُنھیں کی تعلیم سے وہ ذاکر و شاغل ہوئے۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد وہ ایک دن حافظ صاحب کے سامنے بہت روئے اپنے ذکر و شغل اور طریقۂ تعلیم کو کہا اور جو انوار و تجلیات اُن کو نظر آتے تھے اُن کو بیان کیا اور فریاد کناں حافظ صاحب کے پیر و مرشد کے حضور میں حاضر ہو کر اُن کے پیر بھائیوں میں داخل ہوئے اور مرتے دم تک ریاضت و مجاہدات میں لگے رہے۔

قاضی صاحب کا طریقہ ابو العلائی تھا' اور اسی طریقہ کی ریاضت اُن کا مسلک رہی وہ وحدت وجود کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور شریعت کے رنگ میں رنگے ہوئے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

اُن کی روش زندگی تھی' خانقاہوں میں جاتے بزرگان دین سے ملتے' اعراس میں لازماً شریک ہوتے۔ اُن کو حال آتا بھی تھا اور نہ بھی آتا تھا یعنی وہ رقص تو نہیں کرتے مگر اپنی جگہ سے آدھا اُٹھ جاتے' اللہ اللہ کا نعرہ مارتے اور آٹھ آٹھ آنسوؤں روتے یہی اُن کا بھی حال تھا'

ایک دفعہ تکیہ پر عرس تھا قاضی صاحب شریک تھے قوال گا رہا تھا :

منم وہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپردن | برخ تو دیدہ باشم تو درون دیدہ باشی
صنما بدور مستی بسرت قسم کہ روزے | ز تو دیدہ ام ادائے کہ تو ہم ندیدہ باشی

ان دونوں شعروں پر قاضی صاحب کو حال آیا' اللہ کا نعرہ مارا اپنی جگہ سے نصف اُٹھ کھڑے ہوئے اور آنکھ نے دل کی ہمدردی کی۔

ایک دفعہ قوال گا رہا تھا " دوسرے نہ بیاں جی کی بتیاں ہورا ما کہاں لے سناؤں"۔ قاضی صاحب کو حال آیا۔ حالت بدلی تو چیخ اُٹھے " اوسری ہے نہ دسری گی " یعنی لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا۔ گویا اس آیت کے مطلب نے اُن کو مست کیا۔

ایک سچے مخلص و جوان صالح نے ان کے اخیر زمانہ کے دو واقعے جن میں وہ خود موجود تھ

خود مجھ سے بیان کئے۔ ایک یہ کہ قاضی صاحب اپنے مرشد جناب مبارک حسین ابوالعلائی قدس سرہٗ کے عرس میں جو بارہ ذی الحجہ کو داناپور میں ہوا کرتا ہے جہاں اُن کا مزار پُرانوار واقع ہے شریک ہوئے۔ مجلس سماع گرم تھی، قوال نے یہ مشہور غزل شروع کی ؎

تم بر سر تابوتم وقت ست کہ فرمائی — اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی

جب اُس نے یہ شعر گایا

کردیم زخون خود آرائش کوئے تو — واری خبرے یا نہ اے محو خود آرائی

تو قاضی صاحب پر ایسا وجد طاری ہوا کہ رقص بسمل کا سماں چھا گیا اور ان کی یہ بیخودی و ازخود رفتگی گھنٹوں تک قائم رہی۔

دوسرا واقعہ یہ کہ ایک دفعہ شاید صبح کے وقت قاضی صاحب پیادہ پا ٹہلتے ہوئے اپنے مکان سے محلہ شاہ کی املی کی طرف جو بہت قریب ہے روانہ ہوئے صرف یہ جوان عزیز ساتھ تھے اور کوئی نہ تھا۔ راستہ میں باتیں کرتے کرتے انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ کوئی خدا کو بھی پاتا ہے یا نہیں۔ اس وقت یہ دونوں کنگھیا ٹولہ کی سڑک سے شمالی گلی میں مڑ چکے تھے قاضی صاحب نے کہا کہ خدا کا پانا یہی ہے کہ اُس کے نہ پا سکنے کو پالے یعنی حسرت نایافت۔ اور جو کوئی یہ کہے کہ میں نے خدا کو پالیا تو یا تو اُس نے اپنی غایت یافت کو خدا سمجھا ہے یا وہ جھوٹا ہے۔ یہ سب الفاظ کی ترکیبیں ہیں۔ یہ کہا اور بے اختیار ان کے دل سے ایک نعرہ نکلا اور وہ بیقرار ہو کر مسجد کے پاس جگر تھام کر بیٹھ گئے۔ وہ رستہ چلتا تھا اس لئے ایک صاحب تو مسجد سے نکل آئے اور دو ایک راہ گیر بھی حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا ماجرا ہے مگر یہاں خبر کسے تھی۔ دیر کے بعد جب یہ حالت رفع ہوئی تو آگے بڑھے،

اُن کو حال قال کی مجلسوں میں اکثر شورش ہوا کرتی تھی اور وہ جس درجہ کے ضابط و بے ریا اور صاحب صدق و خلوص تھے اُس کے اعتبار سے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اُس میں ذرہ برابر بھی آورد یاریا کو دخل تھا لیکن بعض انگریزی تعلیم یافتہ دوستوں نے جو اس کوچہ سے بالکل نابلد تھے جب کبھی اُن

سے پوچھا کہ یہ "حال و شورش" کیا چیز ہے اور آپ بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ تو صرف اس قدر فرمایا کہ "کبھی مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کو بس ایسا ہی سمجھو جیسے تم کو کوئی شعر بہت پسند آجائے اور تم بے اختیار اس پر وجد کرنے لگو۔"

قاضی صاحب کا مسئلہ وحدت وجود پر دل سے ایمان و اعتقاد تھا اور وہ اس کے دل سے شیدا تھے، وہ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں اگر وحدت وجود کا مسئلہ نہ ہوتا تو کبھی یہ اعلیٰ درجہ کا مذہب نہ ہوتا اور میں تو اس کو قبول نہ کرتا۔ اُن کا یہ بھی قول تھا کہ مسئلہ وحدت وجود اور دہریت کے بیچ میں بہت باریک واسطہ ہے جس کو پل صراط سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ جس نے اس کو عبور کر لیا وہ ابدی جنت میں پہونچا۔ نہیں تو پھسل کر دہریت کے ابدی جہنم میں گر گیا۔ اسی مضمون کو مزاح کے پیرایہ میں یوں بھی فرماتے تھے کہ دہریہ وحدت وجودیہ کا سوتیلا بھائی ہو۔

حیدر آباد میں ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ ہمارے سر سید بھی وحدت وجود کے قائل ہیں مجھ سے اور اُن سے آج اس مسئلہ کے متعلق خوب باتیں ہوئیں مگر سید صاحب کہتے ہیں کہ "یہ باتیں کہنے کی نہیں ہیں"۔ کسی بزرگ نے اس مضمون کو اس طور پر ادا کیا ہے

از ساحت دل غبار کثرت رُفتن   خوشتر کہ بہرزہ درِ وحدت سُفتن

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا   واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

بارہا اُن کی زبان سے یہ بھی سُنا کہ جب تک آدمی کافر نہیں ہوتا مومن نہیں ہو سکتا، یعنی جو لوگ سوچنے اور سمجھنے والے ہیں اُن کے سامنے بہت سی گھاٹیاں آتی ہیں اور جب تک وہ اُن میں رہتے ہیں کفر کی حالت میں رہتے ہیں اور جب خدا کے فضل سے اُن سے باہر نکل آتے ہیں یعنی اُن کے شکوک و شبہات رفع ہو گئے تو اُن کا ایمان کامل اور پختہ ہو جاتا ہے۔ کبھی خدا کے وجود کی نسبت خطرات آتے ہیں، کبھی انبیاء کی رسالت کے بارے میں اعتراضات سوجھتے ہیں اور کبھی وحی و الہام پر شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا کا فضل جس کے شامل حال ہوتا ہے اور جس کے دل میں صدق و خلوص کے ساتھ سچی طلب ہوتی ہے اُس کے دل سے یہ سب مشکلیں خود بخود دور ہوتی جاتی ہیں اور اُس

کے قلب کو اطمینان ہوتا جاتا ہے ؎

کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمّا را

وہ فقر کے کل طریقوں کو یکساں نظر سے دیکھتے اور سب کو اچھا سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اصل مقصود کو دیکھتے تھے، چنانچہ میں جب مرید ہوا تو اس کے بعد اُن سے ملنے کا ہمیں حیدرآباد میں اتفاق ہوا اسٹیشن پر تو عام ملاقات ہوئی وہاں استقبالی ڈیپوٹیشن کے اژدحام میں باتیں کرنے کی مہلت کہاں تھی لیکن دوسرے دن جب میں اُن کی خدمت میں بشیر باغ میں حاضر ہوا تو مجھ سے معانقہ کیا اور بیٹھنے کے بعد فوراً پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ آؤ ایک مرتبہ اور ملیں۔ میں نے پوچھا یہ کیسا؟ تو فرمایا کہ تم مرید ہو گئے اور اس وجہ سے میرے بھائی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں طریقہ میں مرید ہوا ہوں اور آپ اور طریقہ میں ہیں۔ فرمایا کہ سب طریقے ایک ہی ہیں۔

جہاں کہیں وہ تشریف لے جاتے تو وہاں کے فقرا کو دریافت فرماتے اور ان سے ملتے چاہے کسی کام کے لئے کہیں جائیں۔ ایسے ذوجہتین آدمی بہت ہی کم ہوتے ہیں کہ دنیا و دین دونوں پہیوں کو ساتھ ساتھ چلائیں تاکہ نجات کی گاڑی منزل مقصود کو جلد پہنچے۔ اسی لئے جس خالص نیکی کی نیت سے وہ دین کا کام کرتے تھے اُس نیت سے دنیا کے کام بھی انجام دیتے تھے۔ مثلاً حیدرآباد آئے تو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ڈیپوٹیشن میں مگر یہاں بھی خاصان خدا اور اہل اللہ سے ملنے کا شوق اُن کے ساتھ تھا۔ مجھ سے یہاں کے فقرا اور بادیان طریقت کے نام اور پتے پوچھے۔ میں نے اپنی بہت محدود واقفیت سے چند لوگوں کا پتہ دیا۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمانے لگے کہ جناب مسکین شاہ صاحب سے ملکر طبیعت بہت ہی خوش ہوئی۔

قاضی صاحب رہبانیت کے دلدادہ نہ تھے بلکہ اسلام کے جاں نثار تھے۔ چنانچہ اسلام کے متوسط اور صحیح کی پیش ہونے پر ایک مرتبہ نہایت عمدہ تقریر فرمائی جس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ میں موسوی شریعت سے شروع کرتا ہوں کیونکہ موسوی شریعت کی کتاب توریت باوجود تحریف کے اب تک موجود ہے۔ تو موسوی شریعت آئی لیکن باوجود اس کے کہ ہر ایک سچی شریعت کا اصل مقصود ایک ہی

رہا ہے تاہم زمانہ کے اقتضاء اور مخاطبین کی حالت کے لحاظ سے اصل مقصود کے حاصل کرنے اور خدا رسی کا طریقہ جداگانہ رہا ہے یعنی ترغیب و ترہیب کا پیرایہ ہر دور میں اس کے مناسب حال اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ توریت میں اوامر الٰہی کی ترغیب دلانے کے لئے کہا گیا تھا کہ تمہاری کھیتیاں خوب لہلہائیں گی، غلہ خوب پیدا ہوگا، سستے سمے میں رہو گے، تمہاری اولاد کی افزونی ہوگی۔ مویشی خوب بڑھیں گے دودھ دہی کی بہتات ہوگی، باغوں میں پھلوں کی افراط ہوگی وغیرہ۔ اور نواہی سے بچنے کے لئے اس طرح پر ڈرایا گیا تھا کہ تمہاری کھیتیاں جل جائیں گی، غلہ پیدا نہ ہوگا، کال کی سختیاں جھیلو گے، اولاد کی کمی ہوگی، مویشیوں میں مری پھیلے گی، دودھ دہی کو ترسو گے، باغ سوکھ جائیں گے وغیرہ وغیرہ لیکن جیسے جیسے صاحب وحی والہام کے زمانہ کو بُعد ہوتا گیا لوگ اصل مطلب سے دور ہوتے گئے اور مادیت پھیلتی گئی، لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے عاقبت کوئی چیز نہیں۔ اچھے اور بُرے اعمال کی جزا و سزا بھی دنیاوی ہی آرام و تکالیف ہیں بس، جب یہ خرابی حد درجہ تک پہونچ گئی اور مادیت کا زہریلا اثر تمام پھیل گیا، دنیا طلبی کے انہماک نے اخلاق کی جڑ کھود ڈالی۔ تب اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کو مبعوث کیا۔ اس زمانہ میں چونکہ مادیت کا پلہ بہت جھک گیا تھا اس لئے میزان شریعت کے دونوں پلوں کو برابر کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ روحانیت ہی پر پورا زور دیا جائے۔ اور جو کچھ تعلیم ہو وہ روحانیت ہی کی۔ اسی لئے حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے تاہل اختیار نہیں کیا اور اس کا پُر زور اعلان کیا کہ جو دنیوی مال و دولت چاہے گا اس کو آسمان کی بادشاہت میں ذرا بھی حصہ نہ ملے گا۔ آج اگر کھانے کو مل جائے تو ہرگز کل کی فکر نہ کرو۔ کوئی قبا مانگے تو اُسے اپنا کرتہ بھی اُتار کر دیدو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جیسے جیسے ان کے زمانہ سے لوگ دور ہوتے گئے فطرت کے قاعدہ کے مطابق اس میں بھی غلط فہمیاں راہ پاتی گئیں اور لوگ سمجھ بیٹھے کہ دین و دنیا بالکل متخالف و متضاد چیزیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہبانیت پھیل گئی اور دنیا دار آخرت سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے۔ تب ہمارے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا نے ختم المرسلین بنا کر بھیجا جنھوں نے خدائی شریعت کی تکمیل کر دی اور تعلیم الٰہی کو خاتمہ تک پہونچا دیا۔ آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی کہ محض مادیت ہی صحیح نہیں اور جزا وسزا محض دنیا ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ روحانیت بھی ہے اور عالم آخرت بھی، ایک دن روز جزا ضرور آنے والا ہے اور اس پر ایمان لانا فرض ہے، یعنی نہ محض دنیا ہی دنیا ہے نہ محض روحانیت ہی روحانیت نہ مادیت ہی صحیح نہ رہبانیت ہی ٹھیک۔ ہر چیز ظاہر و باطن رکھتی ہے، اور ہر جسم جسم و روح سے مشترک ہے۔ نہ دین دنیا سے الگ ہو نہ دنیا دین سے۔ اس لئے صراط مستقیم صحیح کی یعنی دونوں کے درمیان کی راہ ہے یا دونوں پگ ڈنڈیوں کی ملی ہوئی سڑک، یعنی ہر چیز دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا خرچ کرنا، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، غرض سب کام تم کو خدا سے بھی ملا سکتے ہیں اور تمہارا ٹھکانا جہنم میں بھی بنا سکتے ہیں۔ نیت سے سب کام اچھے برے ہوتے رہتے ہیں۔ جیسی نیت ویسی برکت، یہ مسئلہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی۔ مگر ایک نقل میں بیان کرتا ہوں جس سے یہ مسئلہ بخوبی تمہاری سمجھ میں بھی آجائے گا۔

برسات کا زمانہ شام کا وقت اور چاروں طرف ابر گھرا ہوا تھا اس وقت ایک فقیر نے اپنی بی بی سے کہا کہ جاؤ دریا کے اس پار ایک فقیر بھوکا ہے اس کو کھانا کھلا آؤ۔ بی بی نے کہا کہ شام کا وقت ہے اور دریا چڑھا ہوا ہے اس وقت نہ کشتی مل سکتی ہے نہ ملاح ہی۔ بھلا میں کیونکر جا سکتی ہوں اس نے کہا کہ جاؤ اور دریا کے پاس پہنچ کر میرا نام لینا اور یہ کہنا کہ اس نے کہا ہے کہ اس بات کی برکت سے کہ آج تک میں اپنی بی بی کے ساتھ بھی ہمبستر نہیں ہوا ہوں تو مجھے راہ دے۔ بی بی نے حکم کی تعمیل کی اور اسی تدبیر سے دریا کو عبور کرکے اس پار پہونچی۔ وہاں اس فقیر کو کھانا کھلایا اور جب چلنے کو ہوئی تو اس نے اس فقیر سے کہا کہ رات ہوگئی ہے اور دریا ناقابل گزار ہے میں جاؤں تو کیونکر۔ اس نے پوچھا کہ پھر تو آئی تھی کیونکر۔ وہ جس طرح آئی تھی اس کو بیان کیا۔ اس فقیر نے کہا کہ اچھا اب کے دریا کے پاس پہونچ کے میرا نام لینا اور یہ کہنا کہ اس نے کہا ہے کہ بہ برکت اس کے کہ آج تک میں نے کھانا نہیں کھایا ہے تو مجھے رستہ دیدے۔ وہ عورت اس کو سنکر چلنے کو تو چلی اور پہلے تجربہ سے یہ بھی سمجھی کہ کام نکل جائے گا لیکن وہ سخت حیرت کے دریا میں غوطہ زن تھی

قاضی صاحب کی زندگی کے روحانی حصّہ کو اگر دیکھا جائے اور اُن کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے خصوصاً اخیر اٹھارہ بیس سال کے واقعات پر غائر نظر ڈالی جائے تو کچھ شک نہیں کہ ہر منصف مزاج اور بے تعصب شخص یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ان کی دل گداختگی، نرم مزاجی، انکسر نفسی خلقت میں داخل تھی اگر سادگی اور بھولاپن اور رحم و کرم ان کے مزاج میں داخل تھا۔ آزادی طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی اور بے تعصبی ملکہ راسخہ، تحمل و رواداری خاصۂ طبیعت ہو گئی تھی اور غصّہ، غرور، کبر و حسد کی ہوا تک چھو نہ گئی تھی۔ عبادات و معاملات کے دونوں پہیوں کے مساوی اور درست ہونے سے زندگی کی گاڑی منزل مراد پر بے خوف و خطر پہونچی اور پچھلوں کے لئے نشان راہ چھوڑ گئی۔ نہ خدا کے حقوق فروگذاشت ہوئے نہ بندوں کے۔ ایک انسان میں اتنی اعلیٰ صفتوں کا مجتمع ہونا نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ میں اگر قاضی صاحب کی نسبت یہ لکھوں کہ وہ ایک صاحب تمکین فقیر و ولی تھے اور اپنی اس حالت پر ہمیشہ پردہ ڈالے رہے تو "ولی را ولی می شناسد" کی بنا پر معاصرین کہہ اُٹھیں گے کہ قاضی صاحب چاہے ولی ہوں یا نہ ہوں اس پردہ پوش سگ دنیا جس کے کرتوت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اپنی ولایت کا تو ضرور مدعی ہے۔ لیکن میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ حاشا وکلّا میں فقیری کے کوچہ سے ایسا ہی نابلد و ناآشنا ہوں جیسا کہ آسٹریلیا کے وحشی مذہب اسلام کی خوبیوں سے۔ اور اسی لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسب و ریاضت۔ فقر و طریقت میں قاضی صاحب کا کیا درجہ اور کیا پایہ تھا لیکن جو صفات ان کے میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان کو خواص و عوام روزمرہ کے برتاؤ میں اُن میں برائے العین مشاہدہ کرتے تھے اور اکثر سچے دل سے اس کی گواہی دیتے تھے کہ ان میں بہت سی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو مافوق العادت ہیں اور اہل دنیا میں تو ہرگز دیکھی نہیں جاتیں۔ یہ تو قاضی صاحب کے اخیر زمانہ کے افعال و صفات تھے اور اس لئے جن لوگوں نے ان کو اسی زمانہ میں دیکھا وہ شاید اس خیال سے کہ جو چیز روزانہ نظر کے سامنے آئے اور جس کو آدمی آنکھیں کھولتے ہی دیکھے اور برابر دیکھتا رہے اس کی نسبت بہت ہی کم غیر معمولی اور مافوق العادت ہونے کا گمان ہوتا ہے ان کو پوری وقعت اور اصلی عظمت کی آنکھ سے نہ دیکھا۔ لیکن جب ان کو یہ بتا دیا جائے کہ انہوں نے ایک دم سے اس زمانہ کی سررشتہ داری

کیا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ دونوں ایسے دیدہ دلیر جھوٹے اور ان کی باتوں میں یہ تاثیر۔ اپنے شوہر ہوئے کا جھوٹ تو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ اور یہ دوسرے صاحب بھی میری آنکھوں کے سامنے سارا کھانا چٹ کر گئے اور پھر کہتے ہیں کہ یہ برکت اس کے کہ آج تک میں نے کھایا نہیں۔ واہ ری برکت ایسی برکت پر خدا کی سنوار۔ وہ نیکبخت دل ہی دل میں یہ باتیں کرتی اور دریائے حیرت و تعجب میں غوطے کھاتی گھر پہونچی۔ اُس کے شوہر نے آنے جانے کا حال پوچھا اُس نے واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یہ سب تو ہوا مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم دونوں جھوٹے اور پھر تم دونوں کے جھوٹ میں یہ تاثیر۔ اُس نے کہا کہ نہیں نہیں۔ وہ بھی سچا اور میں بھی۔ نہ اس نے خواہش نفسانی سے کھانا کھایا۔ نہ میں خواہش نفسانی سے تمہارے پاس پھٹکا۔ دونوں کا کام خدا کی رضا خدا کا حکم اور ادائے حقوق و ادائے فرض کی نیت سے تھا۔ ہم دونوں کے کام کا مرجع خدا تھا ہم دونوں بیچ میں نہ تھے۔ اس لئے نہ میں تمہارے پاس پہونچا۔ نہ وہ کھانے کے قریب آیا۔

انسان کے سب کاموں کا یہی حال ہے۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بُدن ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

وہ بارہا فرماتے تھے کہ اسلام نے دنیا کو دین بنا نا سکھایا ہے تو دینداری کے دو جزو ہیں ایک عبادات اور دوسرے معاملات۔ عبادات کا واسطہ خدا سے ہے تو یہ آسان بھی ہے اور اس لئے عبادات کے اچھے تو بہت آدمی ہوتے ہیں لیکن معاملات کی گھاٹی ذرا سخت ہے کیونکہ ان سے حقوق عباد متعلق ہیں۔ اور ہماری شریعت نے اسی پر بہت زور دیا ہے اور صاف جتلا دیا ہے کہ حقوق اللہ کو تو اللہ معاف بھی کر دے گا اگر وہ چاہے گا کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے لیکن حقوق عباد کو تو وہ معاف کرے گا ہی نہیں جب تک کہ ہی ذی حق معاف نہ کرے۔ افسوس اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ جب سے مسلمانوں کا ماٹ بگڑا ہے عبادت تو خیر تھیک آدمی کر لیتے بھی ہیں لیکن حقوق عباد کو دیکھو تو عوام تو عوام خواص بھی جو اپنے کو عابد و زاہد و متقی و پرہیزگار سمجھتے ہیں اکثر اُن کے معاملات بھی خراب اور خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔

جو دنیا داروں کے نزدیک ایک بہت بڑی عزت وحکومت کی چیز ہونے کے علاوہ آمدنی کثیر کا ذریعہ ہوتی تھی۔ اور روزمرہ کی محفل عیش ونشاط کو معہ اس کے کل لوازم کے چھوڑ کر ایسے وقت میں کہ جوانی کی امنگیں دل میں باقی تھیں اور کس طرح ؎

اے خوش توبہ آں زماں کردی	کز ترا طاقتِ گناہ نماند

کے مصداق نہ ہوئے تھے۔ توبہ نصوح کی۔ اور خدا وند تعالےٰ سے سچا عہد باندھا کہ پھر تادم مرگ اس کوچہ کی طرف رُخ نہ کریں گے اور ہزاروں آدمی اس کی شہادت دیں گے کہ اُنہوں نے اس عہد کو باخلاص پورا کیا اور مولٰنا سید شاہ امیر الحسن قدس سرہٗ ابوالعلائی سے جن کی ولایت ومعصومیت کی سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں بیعت ارادت کی۔ اور ان کے وصال کے بعد جناب شاہ مبارک حسین ابوالعلائی قدس سرہٗ کے مسترشد ہوئے اور علی الترتیب دونوں کاملین ومکملین وقت سے سالہا سال تعلیم پاتے رہے اور بادیۂ عشق کے کوچہ کی بھی (جس کو اہل طریقت بہترین وقریب ترین زینہ وصول الی اللہ کا قرار دیتے ہیں) ٹھوکریں کھائیں۔ توبگمان غالب خود وہ لوگ رائے قائم کریں گے کہ وہ کون تھے اور کیا تھے

قاضی صاحب کے زمانہ میں پٹنہ ایسا تباہ نہ ہوا تھا دولتمند اور عمائدین شہر کے کروفر سے پٹنہ گونج رہا تھا۔ قاضی صاحب کی دولت اُن کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ پھر آخر صفات حسنہ کے سوا جو تصوف کی بنیاد اور صفائی باطن کی شاہد عادل ہے کون سی چیز تھی جو قاضی صاحب کو اپنا زمانہ میں ممتاز و ممدوح کئے ہوئے تھی۔ پٹنہ میں کوئی کھڑا نہ ہوا کہ اُن کی جگہ لے سکے۔ اور کتنی آنکھیں ہیں جو آج تک اُن کے لئے پُرنم ہیں۔

میں ایک بہت بڑے بزرگ کی شہادت بھی پیش کرتا ہوں جس سے قاضی صاحب کی بزرگی اور صفات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

قاضی صاحب کا خط بنام جناب سید شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری قدس سرہٗ اور اُس کا جواب

یہ دونوں خط خود قاضی صاحب نے اپنی بیاض میں اپنے قلم سے نقل کئے تھے جیسا کہ ان خطوط کی تاریخ ومضمون سے ظاہر ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط اخیر ۱۳۰۳ھ کے ہیں جبکہ قاضی صاحب

اور اُن کے ساتھ مولوی فضل الرحمٰن صاحب رئیس ڈومری کو ظاہر میں عوام اور حاسدین کالانعام بڑے غلو کے ساتھ سید احمد خانی نیچری مشہور کئے ہوئے تھے اُسی زمانہ میں بعض ایسے شخص یا اشخاص نے جو بظاہر معتبر سمجھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب کو یہ خبر پہونچائی کہ شاہ صاحب ممدوح نے آپ کی اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب کی ہجو لکھی ہے اور اس کو چھاپ کر شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس خبر کو سُنکر قاضی صاحب نے اُن کو یہ خط لکھا ہے:

مخدومی و مکرمی جناب سید شاہ محمد اکبر صاحب دام مجدکم۔ تسلیم۔ معتبر وسیلوں سے مجھے خبر ملی ہے کہ بالفعل آپ نے کوئی رسالہ نظم کیا ہے جس میں کنایۃً کچھ میرے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اُن افواہ کے قلمبند کرنے میں تو اپنا وقت ضائع نہیں کیا ہوگا جس کو عوام الناس بغیر تحقیق کئے ہر کس و ناکس کی جانب رجمًا بالغیب منسوب کیا کرتے ہیں۔ بلکہ ضرور آپ نے لکھنے سے پہلے محققین کی طرح ان حالات کی صحت وسقم پر شرعی طور سے علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کافی شہادتیں حاصل کرکے اور اُن سب امور کو مرتبۂ یقینیات میں پہونچا کے رسالہ میں مندرج فرمایا ہوگا۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اُس رسالہ میں میرے جو کچھ عیوب لکھے گئے ہوں گے وہ ضرور میرے نفس کی ہدایت و اصلاح میں نہایت مفید ہوں گے۔ اور اگر فضل الٰہی شامل حال ہے تو اُس رسالہ کو اپنے لئے میں آلۂ بصیرت سمجھوں گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ضرور اُس سے نفع اُٹھاؤنگا۔

بھائی اکبر صاحب یقین مانئے کہ خوشامد سے مُنہ پر تعریف کرنے والے ہزاروں ہیں۔ مگر اپنے دوست کو اُس کے عیوب سے خبر دینے والے بہت کم ہیں۔ حقیقت میں آپ کا میں نہایت مشکور ہوں گا اگر آپ کے ذریعہ سے مجھے اپنے نفس کے کیدوں پر پوری اطلاع ہو جائے گی۔

میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ اُس منظوم رسالہ کے چھاپنے میں آپ کے دوستوں کو چندہ دینے کی اجازت ہے۔ چونکہ آپ کے والد ماجد قدس اللہ سرہ العزیز کے میں ایک کمترین خادمان سے اور آپ کا سچا خیر اندیش ہوں اس لئے مجھے اس امر کی جرأت ہوئی ہے کہ میں اس چندہ میں شریک ہونے

تا آپ سے استدعا کروں۔ چنانچہ اسی غرض سے مبلغ دس روپیہ آپ کی خدمت بابرکت میں پہونچے
ہیں امید ہے کہ اُس رسالہ کے چھاپنے میں صرف کئے جاویں اور حسب رسدی احباب کے چند
جلدیں اُس کی مجھے بھی مرحمت ہوں۔

مگر اُس رسالہ میں اگر کسی دوسرے شخص کی ہجو کی گئی ہو تو میرے روپئے اُس کے چھاپنے میں
ہرگز صرف نہ کئے جاویں۔ وجہ یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ لوگ جن کی ذری بھی سمجھ صاف ہو
یا تھوڑی بھی عقل سلیم رکھتے ہیں کسی کے ہجو کرنے یا گالیاں دینے سے ذرا بھی رنجیدہ نہیں ہوتے اُس
سے اُن کے دل کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہونچتی ہے پھر میں اپنے روپیہ کیوں ضائع کروں علاوہ اس
کے کسی دوسرے شخص کی ہجو یا بُرے تذکرہ کے مشتہر کرنے میں خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان اپنا
روپیہ خرچ کرنا میں جائز بھی نہیں سمجھتا۔ ایسی صورت میں یہ دس روپیہ آپ کے ذاتی مصارف کے لئے
میری طرف سے نذر قبول ہوں۔ والسلام

آپ کا سچا خیر اندیش رضا حسین عفی عنہ۔ دہم صفر ۱۳۰۱ھ روز شنبہ (۱۱ دسمبر ۱۸۸۳ء)

اس وقت کرم فرما حافظ عالم علی صاحب تشریف لائے اور آپ کا محبت آمیز پیام انہوں
نے پہونچایا اور تہہ دل سے مشکور کیا۔ ہر چند اس خط کے بھیجنے کی اب ضرورت باقی نہیں رہی تھی
مگر جب حافظ صاحب مکرم کے بیان سے معلوم ہوا کہ آپ کو ایسا خیال پیدا ہوا ہے کہ آپ کی
جانب سے مجھے کچھ ملال پہونچا اور کوئی رنج آمیز خط بھی میں نے آپ کو لکھا ہے تو اُسی وقت میں نے
بقسم اُس کی تردید کی اور جو خط میں نے آپ کو لکھا تھا اُس کو جیب سے نکال کر حافظ صاحب
کو پڑھ کر سُنا دیا۔

اب یہ خط صرف اس خیال سے ارسال کرتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جاوے کہ مجھے نہ پہلے
رنج تھا اور نہ اب رنج ہے بلکہ پہلے بھی میں آپ کا مشکور تھا اور اب بھی مشکور ہوں۔

بھائی اکبر صاحب یقین جانئے میں اپنی کمال بدنصیبی سمجھوں گا اگر مجھے اپنے مخدوم زادوں
سے کسی وقت خدانخواستہ کچھ ملال پہونچے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عوام الناس نے میرے بارہ میں

جھوٹھ موٹھ کا شور و غل مچا رکھا ہے کل یعمل علی شاکلتہ پھر الحمد للہ کہ آپ کے بزرگوں کی برکت سے مجھے کسی ایک سے بھی رنج نہیں ہے ؎

کار کج خود مبیں گذار و بہر کسے   آب تگذار و صفا بہر خسے

والسّلام

آپ کا خیر طلب ۔ رضا حسین عفی عنہ ۔ ۱۳ ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء پنجشنبہ

جواب

حضرت اخی الاعظم دام برکاتکم تسلیم بصد تکریم عرض کرتا ہی ۔

واللہ ثم باللہ کہ میں نے صراحتہً آپ کا ذکر ایک رسالہ شور قیامت میں جس کی تقریظ جناب اخی الاکرم شاہ محمد یحیٰی صاحب مدمجدہ تحریر فرما چکے ہیں کیا ہے ۔ اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب کا بھی ذکر اس میں ہے ۔ اور تردید اس شہرت کی کی ہے جو آپ کی اور مولوی صاحب کی نسبت ہے ۔ اور میں آپ کو اپنی فہم کے موافق صاحب نسبت و کیفیت سمجھتا ہوں اور مسلمان ہونا تو اور معنی میں ۔ وہ رسالہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے کہ جس کی عبارت ارسال خدمت کروں ۔ اور جس رسالہ منظومہ کا ذکر جو آپ نے سنا ہے واللہ ثم باللہ کہ ہرگز میری مراد آپ سے نہیں ہے نہ کسی خاص شخص سے ہے مگر میں اُن معتقد و مسائل کی تردید کرنا بھی اپنے عقیدہ کے موافق نا سزا وار سمجھتا ہوں اور میں آپ کا کمال ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنا نیاز مند خاص تصور فرما کر اس تردد سے جو مجھے بے سبب واقع ہو گیا تھا نجات دی اور میرا یہ کام نہیں کہ میں نامی اور سخن چینی کروں وگرنہ اُس وحدہٗ لاشریک کی قسم ہے کہ انھیں حضرات نے جو نمام ہیں کیا کچھ کہا ہے ۔ خیر میں اپنے جرم ناکردہ کا عفو چاہتا ہوں ۔

ندامت گنہم دوست را رحیم کند   شکستِ توبہ امم آ و از الکریم کند

نیک باشی و بدت گوید خلق   بہ کہ بد باشی و نیکت گویند

مبلغ دہ روپیہ مرسلہ جناب با قسم و تبرکاً برسر خود نہادم ۔   آپکا نیاز مند محمد اکبر عفی عنہ ۔ از دانا پور

رنگ صحبت | تبدیل خیالات اور تغیر حالات۔ عزلت گزینی اور پرانی طرز زندگی کو چھوڑنے اور نئی روشنی میں داخل ہونے کے بعد قاضی صاحب کی آمد و رفت اور دوستی و محبت کا دائرہ اس قدر وسیع اور ایسے متخالف و متضاد و متباین فضا میں پھیلا ہوا تھا کہ اس سے پوری واقفیت کے بعد انسان کامل یقین اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے بے تعصب اور غایت درجہ کے روادار تھے۔ اور بیشک اُن کا اثر اس قدر پہنچا تھا کہ لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اپنے پیر و مرشد جناب حاجی قاری مولانا سید امیر الحسن صاحب قدس سرہٗ کے سارے خاندان اُن کے اخوان باصفا اور اپنے پیر بھائیوں کے علاوہ پٹنہ اور مقامات پٹنہ کے اکثر سجادہ نشینوں سے اُن کو پورا خلوص اور سچا روحانی تعلق تھا جس میں سے خصوصیت کے ساتھ جناب شاہ میاں جان صاحب شاہ محمد یحیٰی شاہ عزیز الدین صاحب شاہ حفاظت حسین صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ ضروری ہے۔ اسی روحانی تعلق کے سبب سے وہ مختلف خانوادوں کے اعراس مجلس حال و قال میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ آخر دم تک جس طرح سے کہ قومی جلسوں اسلامی انجمنوں رفاہ عام کی کمیٹیوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے اُسی طرح سے بزرگان دین اور اولیا کاملین کے اعراس و مجالس کی شرکت کو کبھی ناغہ نہیں کیا جس مستعدی و سرگرمی و گرم جوشی کے ساتھ اپنی قوم و ملت کے حقوق ادا کرتے تھے اسی طرح نفس کے حقوق بھی ادا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دن کو میونسپل کمشنری اور بنچ کے کام انجام دیکر آئے اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک صوفیانہ مجلس میں شریک ہوئے۔

ان کی صحبت نہایت دلچسپ و دلکش نہایت مفید و کارآمد تھی۔ اُن کی صحبت میں پہنچنا شرط تھا۔ جہاں کوئی شخص ایک مرتبہ پہنچا اور اُن کا کلمہ پڑھنے لگا جس کا اصلی باعث ان کا وسیع اخلاق، فطری شگفتہ روئی، محض بے تکلفی طبعی خاص و بے ریائی، کثرت معلومات کے ساتھ خلقی ظرافت لسانی تھی۔ بوڑھے جوان اور لڑکے سب سے انہی کے مذاق اور معلومات کے مطابق گفتگو کرتے تھے اوروں کی طرح وہ کسی کی رفتار و گفتار و کردار پر اعتراض نہیں کرتے

تھے۔ وہ ہر شخص کے صرف محاسن پر نظر رکھتے تھے اور اس کے عیوب کی طرف اُن کا خیال جاتا بھی نہ تھا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اُن کی نکتہ چیں و عیب بیں آنکھ تو صرف اپنی طرف تھی اور دوسروں پر پڑتی ہی نہ تھی۔ اور صفت بیں آنکھ دوسروں کے لئے کھلی ہوئی تھی جس کسی میں کوئی صفت پائی اُسے مشہور اور بلند کیا اور جس میں کوئی ممتاز صفت پائی اُسے متحرک کیا۔ وہ بے موقع و بے محل کسی کو نصیحت بھی نہیں کرتے تھے۔ جو لوگ تناسباً کم عمر تھے اور قاضی صاحب کی عمر و وجاہت کے باعث ابتدائی ملاقاتوں میں بہت ادب و لحاظ کرتے تھے تو اُن کو اس حد تک کہ صرف سچا ادب اور خالص وقعت باقی رہ جائے بے تکلف بنا لیتے تھے۔ وہ اگر پہلے سے حقہ پیتے ہوتے تو اُن کو بخلاف عام رواج صوبہ بہار کے حقہ بھی دیتے اور باوجود اُن کے انکار کے اصرار کرکے پلا چھوڑتے تھے۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان جہاں تک کم چیزوں کا خوگر ہوگا اسی قدر دنیا میں راحت و آرام سے بسر کرے گا جہاں تک ہو سکے انسان خصوصاً طلبہ فضول اور ایسی چیزوں کی عادت اپنے پیچھے نہ لگائیں جو ضروریات زندگی میں داخل نہیں ہیں۔ جیسے پان، تمباکو، حقہ، چائے وغیرہ۔ لیکن جو شخص کہ ان چیزوں کا خوگر ہو چکا ہے اور وہ مجھ سے ملنا اور میری صحبت میں بیٹھنا ہے اُس کے لئے ضرور ہے کہ بلا لحاظ عمر میں اُس کو آزادی دوں ورنہ وہ میرے پاس بیٹھے گا یا خدمت گاروں کی کوٹھری تلاش کرے گا اور بُری اور رذیلوں کی صحبت میں جا پڑے گا۔

چنانچہ اپنے اخیر زمانہ میں وہ اپنے ایک قدیم دوست کے نوجوان فرزند کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ ایک دن چند گھنٹوں کے بعد اُس نوجوان نے آخر وقت گھر جانے کی اجازت چاہی۔ اُس کے جواب میں قاضی صاحب نے اپنے خانساماں کو بلا کر کہا کہ ان کو چائے کی عادت ہے جلدی چائے بناؤ اور جب ان کی آمد و رفت کو چند دن گذر گئے تو ایک دن اُن کی طرف حقہ بڑھا کر فرمایا کہ اگر پیتے ہو تو میرے سامنے کیوں نہیں پیتے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد

جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ یہ میرے سامنے بے تکلف اور مخلی بالطبع نہیں ہوتے تو اُن کو
اپنے ساتھ سائیں لے گئے اور اس وجہ سے کہ صبح سے لیکر رات کے آرام کے وقت تک اُن
کو برابر قاضی صاحب کے ہی پاس رہنا پڑتا تھا اور حقہ کے خوگر تھے اس لئے اُن کے سامنے
حقہ بھی پینے لگے اور اس قسم کا حجاب اور وہ جھوٹے آداب جو ہم مسلمانوں کی سوسائٹی میں
خُردوں کو بزرگوں سے پورے طور پر مستفید نہیں ہونے دیتے اُٹھ گئے۔ اُن کی مجلس میں کسی
قسم کے غرور و تکبر کا برتاؤ اور امیر و غریب کی تفریق کو ہرگز دخل نہ تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ اُن
کے ملنے والوں میں سے اکثر کے حافظہ میں اس وقت تک تازہ ہوگا کہ ایک مرتبہ حاجی چھوٹے
جو دوندی بازار کے گوٹے پٹھے کا بیوپار کرنے والوں میں سے اور جناب قاضی صاحب کے
پیر بھائی تھے قاضی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ پٹنہ کے ایک بہت بڑے امیر جن
کی نسبت معلوم تھا کہ وہ اپنا حقہ کسی کو نہیں دیتے جن کے مزاج میں غرور و تکبر تھا ملنے کو پہنچے
قاضی صاحب نے اپنا پیچوان اُن کی طرف بڑھایا اور جب اُنھوں نے اُس کو پھیر قاضی صاحب
کو دیا تو قاضی صاحب نے وہی پیچوان میاں چھوٹے کو دیا اور چونکہ ایک رشتہ کی وجہ سے
قاضی صاحب اُن سے مذاق کرتے تھے اس لئے مذاق کے لہجہ میں مسکرا کر اُن سے کہا کہ یہ میں
نے اس لئے کیا ہے کہ تم سمجھو کہ میں تم کو اور میاں چھوٹے دونوں کو برابر سمجھتا ہوں۔ واللہ
میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک تمہاری وقعت کسی طرح میاں چھوٹے سے زیادہ نہیں ہے۔
جتنے لوگ کہ یہاں رہنے والے یا اُن کے ملنے جُلنے والے یا اُن کے اعزہ و اقارب
میں داخل تھے وہ جیسا اعتقاد و خیال رکھتے ہوں کبھی اُن سے اس بارہ میں وہ معترضانہ و
محقرانہ پیش نہیں آتے تھے۔ اور اُن کے بے تکلفانہ برتاؤ اور غیر متعصبانہ خیالات کی وجہ
سے ہر شخص اُن کے سامنے بے روک اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتا اور
دل کھول کر بحث کرتا تھا۔ ان کا مقولہ تھا کہ اگر کسی کی سمجھ ہی اُلٹی واقع ہوئی ہے یا کسی
وجہ سے کوئی بات اُلٹی ہی اُس کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے تو اس میں اس کا قصور کیا ہے۔ اور

اس وجہ سے اس کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص باوجود اس کے کہ کسی بات کو سچ سمجھتا ہو اور پھر اس کی مخالفت کرتا ہو تو یہ اس کی بدنفسی ہو۔

قاضی صاحب کے اس بے تعصبانہ برتاؤ اور مخلصانہ رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدریجاً مگر بہت ہی غیر محسوس طور پر اُن کی صحبت میں بیٹھنے والوں میں سے سب کے خیالات واعتقادات درست ہو گئے حالانکہ ان میں نصف ورجن سے زیادہ ایسے آدمی تھے جو باوجود مسلمان کہلانے کے خیالات میں پورے ملحد دہریہ بددین اور برہموسماج کے معتقد تھے۔ راقم کو چونکہ ان لوگوں سے پوری واقفیت ہے اس لئے تیقن کے ساتھ کہتا ہے کہ ان لوگوں کے خیالات فاسدہ اور عقائد باطلہ کی اصلی وجہ تعلیم کی خرابی اور بُری صحبت کا اثر تھا۔ گو مسلمان گھر میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن سے انگریزی اسکولوں میں داخل کر دیے گئے تھے۔ بہار و بنگال کے اسکولوں اور کالجوں کی حالت یہ تھی اور اب بھی ہے کہ وہ عموماً بنگالیوں اور کسی قدر انگریزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہاں مذہبی تعلیم بالکل مجہول مطلق تھی اور گھر میں کوئی ایسا ذی علم اور راسخ الاعتقاد مربّی نہیں جس کے ذریعہ سے مذہب کے متعلق سُنی سُنائی ہی باتیں دل میں پڑی رہیں۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسکول اور کالج سے پڑھ کر نکلے تو کچھ تو اپنے علوم جدیدہ کے نشہ کے باعث اور کچھ جوانی کی لاپروائی و غرور کے سبب لگے مذہب کی دھجیاں اُڑانے اور مذہبی سچے اور پختہ اصول پر قہقہے لگانے۔ اور جس دائرہ میں وہ نقل و حرکت کرتے تھے اُس میں چونکہ اُن کے دلوں پر غلبہ و عزت بٹھانے والا اور سچی دلسوزی اور پوری شفقت کے ساتھ اُن کے شبہے رفع کرنے والا کوئی نہ تھا اس لئے ان کے خیالات ایک حد تک مضبوط ہوتے جاتے تھے۔ اور جب وہ قاضی صاحب کی صحبت میں پہونچے تو اُن کے بہت سے شبہے تو باتوں ہی باتوں میں اس طور پر رفع ہو گئے کہ خود انھیں بھی خبر نہ ہوئی۔ اور چونکہ ان کی صحبت کا خاصہ تھا طلب حق کا پیدا ہونا بھی اس لئے اُن میں سچی طلب پیدا ہوئی۔ اور سچی طلب ریا و نفاق کی بیخ کن ہے اس لئے ان کے خیالات کا

بدلنا ہی لازمی تھا۔ اُن کے بہت سے شکوک تو آپ سے آپ رفع ہوئے اور بہت سے شکوک بتدریج بحث و مباحثہ کر کے اُنہوں نے مٹا لئے اور آخر میں ریائی و رسمی نہیں بلکہ مخلص و محقق مسلمان بن گئے۔

قاضی صاحب کے گھرے اور مخلص دوستوں میں سے ایک مہدی نواب صاحب مرحوم و مغفور تھے۔ یہ بھی پُرانے رئیسوں اور رامپوروں کی طرح خانہ نشینی اور بیکاری کی زندگی چند اہل غرض اور خوشامدیوں ہی کی صحبت میں بسر کرتے تھے۔ اُن کو بھی اوروں کی طرح دنیا و ما فیہا کی مطلق خبر نہ تھی۔ جن خیالات میں بچپن سے پرورش پائی تھی اُس وقت تک اُسی بسم اللہ کے گنبد میں تھے۔ لیکن جب قاضی صاحب سے اُن کی شناسائی ہوئی اور یاہمی آمد و رفت کے بڑھنے سے وہ بہت جلد استوار و مستحکم دوستی بن گئی تو مہدی نواب صاحب کے عادات و اخلاق میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اپنے شہر کی حالت و حکومت میں دلچسپی لینے اور زمانہ کی رفتار کو خوب سمجھنے اور اپنے شہر کے لوگوں سے یکتا دہ پیشانی ملنے۔ عام جلسوں میں خوشی سے شریک ہونے اور حکام وقت سے بہت اچھی طرح سے ملنے جُلنے اور اُن کے یہاں آمد و رفت کرنے لگے۔ بعض تنگ خیال و حاسد لوگوں نے اپنے محدود و تاریک حلقہ کے اندر یہ افواہ اُڑانا شروع کیا کہ مہدی نواب صاحب قاضی صاحب کی صحبت میں سنی ہو گئے جس کے جواب میں خود مہدی نواب صاحب نے کہا "سنی بنانا تو کجا شیعہ بھی مجھے قاضی صاحب ہی نے بنایا ہے ان سے ملنے سے پہلے میں بھی اپنے ہم مذہبوں کی طرح فقط بالائی اور خارجی ہی رسوم کے بجا لانے اصل مذہب جانتا تھا اور اپنے مذہب سے بالکل بے خبر تھا"۔ قاضی صاحب کے یہاں جو قرآن خوانی کا جلسہ ہوتا تھا اُس میں وہ بھی اپنے یہاں کے مجتہد کے ترجمہ و تفسیر کے ساتھ چھپا ہوا کلام اللہ لیکر شریک ہوتے تھے۔

ان کی صحبت کی اولیٰ خصوصیت یہ تھی کہ پوری آزادگی عایت درجہ کی خندہ روئی اور اعلیٰ درجہ کی شائستگی کے ساتھ جتنی باتیں ہوتی تھیں وہ سب اصلاح کرنے والی اور گرہ میں

باندھ رکھنے کے قابل۔ کبھی جدید یا قدیم فلسفہ کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی شرعی مسائل کی تشریح و توضیح کبھی تصوف کے مسائل حل ہوتے تھے۔ کبھی دقیق مسائل کی موشگافیاں ہوتی تھیں کبھی مختلف مذاہب پر رائے زنیاں ہوتی تھیں اور کبھی توہمات و عقائد باطلہ کی نسبت جہ میگوئیاں کبھی ترقی یافتہ اقوام کے موجب ترقی صفات کی سلسلہ جنبانیاں ہوتی تھیں۔ اور کبھی اُن کی رسوم بد پر نکتہ چینیاں۔ کبھی نامورآوروں اور مفلحوں کا ذکرِ خیر ہوتا تھا تو کبھی اس عالم کے تباہ و برباد کرنے والوں کا عبرت انگیز تذکرہ۔ اور یہ سب کچھ بالکل بے تعصبانہ اور محض نیک نیتی کے ساتھ۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ اپنی نسبت یہ مشاہدہ کرتا رہا ہوں کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں قاضی صاحب کے پاس گیا اور کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھ کر نہ اُٹھا۔ ان باتوں کے ساتھ دل لگی کے اور سامان بھی وہاں موجود تھے۔ ایک طرف شطرنج کی بساط تو دوسری طرف بلیرڈ کی میز بھی بچھی ہوئی تھی۔ جو لوگ اس کے شوقین تھے وہ اُس میں مصروف ہو جاتے تھے اور جو اس کے دلدادہ تھے وہ اُس میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اور خود قاضی صاحب بھی کبھی اول الذکر کے شریک ہو جاتے اور کبھی آخر الذکر کے۔ مرزا شاغل دہلوی جو ایک مستند شاعر ہونے کے علاوہ شاطر بھی تھے اپنے قیام پٹنہ کے زمانہ میں اکثر قاضی صاحب کے یہاں جاکر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ شاہ محمد یحییٰ صاحب بھی جو علاوہ صوفی مشرب ہونے کے شطرنج میں اُستاد مانے جاتے تھے اکثر شریکِ شطرنج ہوتے تھے۔

رل کا شوق ہوا تو اُس کی تکمیل بھی اس درجہ تک پہونچائی کہ دور دور سے ایک طرف بمبئی تو دوسری طرف کلکتہ سے کوئی اہلِ کمال ملنے آیا تو کوئی سیکھنے کے شوق میں آیا۔ میرے عزیز دوست حافظ محب الحق صاحب نے اُس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو فرمایا کہ یہ کام کی چیز ہوتی تو میں شوق سے خود سکھاتا مگر اس میں قطعیت نہیں ہے ذہانت کو بہت دخل ہے۔ اس لئے تیر نشانہ پر لگے یا نہ لگے۔

پہلوانی اور لکڑی سیکھنے کا شوق ہوا تو شہر کے مشہور اُستاد بھگوتے پانڈے کو نوکر

رکھ کر یہ بھی سیکھا۔

ستار کا شوق ہوا تو اس کو بھی سیکھ کر چھوڑا۔ کبھی کبھی شہر کے مشہور ستارے اور ان کے اُستاد پیارے صاحب بھی تشریف لاتے تھے۔

یہ سارا کچھ تصوف کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سیکھا تھا۔ یہ جس راہ میں آئے مزدار آ گئے۔

اُن کا مکان ایک اعلیٰ درجہ کا کلب تھا' عمدہ مہمان خانہ' فرحت بخش تعلیم گاہ' اور بے خبری سے اثر کرنے والی تربیت گاہ' اخلاقی رزم گاہ' انسان بنانے والی بزم عشرت' بے غل و غش مجلس انبساط اور انگریزی خواں نوجوانوں کا خوانِ یغما تھا۔ اب اُس صحبت کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اور بغیر اُس کے یہ شہر آنکھوں میں تاریک معلوم ہوتا ہے' وہ اُس کلب کے ایسے میر مجلس تھے جن کی روش تھی:

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

اس وقت جو آنکھیں اس ویرانے کو دیکھنے کیلئے باقی رہ گئی ہیں وہ بغیر اسکے اور کیا کہہ سکتی ہیں

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

بہت سے امیر زادے' رئیس زادے جو اس نفع رساں صحبت میں پہونچے وہ خود اپنے اور اپنی قوم کے لئے مفید و کار آمد بن گئے' ان کی فہرست دینی اور اُن کے کارنامے بیان کرنے تو ایک نیا دفتر ہی کھولنا ہے' مگر میں ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں' منشی حسن علی صاحب بھاونگنج اسکول میں ٹیچر تھے' رفتہ رفتہ اُن کے عقائد برہمو سماج کے ہو گئے تھے اور یہ کھلم کھلا برہمو سماج کے واعظ بننے کو تھے یہ قاضی صاحب کی صحبت میں پڑے صوفیانہ رنگ تو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کا رنگ ہے۔ وہ قاضی صاحب کے صوفیانہ رنگ میں رنگ گئے۔ آدمی تھے بوشیلے اور ہمت کے لیعنی مادہ تھا تیار' قاضی صاحب نے اُن کے دل میں

وہ تخم بویا جو پھولا پھلا اور ایک دن منشی حسن علی مولوی حسن علی صاحب ہوئے بڑے مشہور اسلامی واعظ و مشنری جن سے ہندوستان کا کونسا خطہ ہوگا جو واقف اور اُن کی خدمتوں کا معترف نہ ہوگا خدا اُن کو غریق رحمت کرے اور اُن کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔

ان کے سوا بہتیرے وہ جو غیر جگہ جا کر مثنوی واں کہلاتے ہیں اُسی سبھا کے تعلیم و فیض یافتہ ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیم جو پھیلی اور پھیل رہی ہے اور یہ رسالت کی خدمت جو منسوخ ہو گئی تھی اور اب جاری ہو رہی ہے اور پٹنہ اور پٹنہ سے باہر بھی جو اس کے جلسے قائم ہو رہے ہیں یہ اُسی چمنستانِ صحبت کے گلدستے ہیں جو اول اول اُنھوں نے ہی آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ خدا اس چمن کو پھولا پھلا رکھے اور اس کی خوشبو سے قاضی صاحب کی روح کو معطر رکھے۔

تعلیم و تربیت کی نسبت قاضی صاحب کا خیال

بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اُن کا صرف خیال اور قول بلکہ اُس کے مطابق اُن کا طریق عمل اس وقت کے مسلمانوں کے لئے بہت ہی مفید اور قابل اقتدا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالےٰ نے اولاد کی تعلیم و تربیت کا فرض اُن کے ذمہ نہیں ڈالا تھا مگر اپنی قوم کی اولاد کو وہ اپنی ہی اولاد سمجھتے تھے اور ہمیشہ اُن کی تعلیم و تربیت کے متعلق نہایت ہی عمدہ اور مقتضائے زمانہ و حالت قوم کے مناسب عاقلانہ حکیمانہ نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ باپ کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کو اس طور پر رکھے کہ وہ اس کو بیجانہ سمجھیں اور ہرگز اُن کے دلوں میں اپنا رعب اور خوف نہ بٹھلائے بلکہ محبت اور شفقت کا بیج بوئے۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ اُس کو دیکھتے ہی وہ سہم جائیں اور اُن کے اوسان خطا ہو جائیں تو اس کی اولاد کے دل ابتدا ہی میں ایسے پژمردہ اور بودے ہو جاتے ہیں پھر کبھی اُن میں پوری شگفتگی اور سچی قوت جو ہماری ترقیوں اور حصول کمالات کی جڑ ہے نہیں پیدا ہو سکتی اور وہ اُن کھیلوں کی

طرح پژمردہ ہو جاتے ہیں جو کھلنے نہ پائیں۔ پڑھانے میں مارنے کے وہ سخت مخالف تھے وہ فرمایا
کرتے تھے کہ اگر بچہ کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی ہے تو اس میں اس کا قصور کیا ہے۔ جس کی سزا
دی جاتی ہے اس کو نرمی و شفقت سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ اگر اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو دو
حال سے خالی نہیں یا تو وہ ذہین اور ہوشمند ہے۔ اور اس پر بھی نہیں سمجھتا تو اس وقت اس کی
طبیعت حاضر نہیں ہے، یا وہ کسی قدر غبی اور بطی الفہم ہے۔ دونوں صورتوں میں پڑھانے والے
کو چاہئے کہ جب اپنے آپ میں برہمی کے آثار دیکھے تو اپنے سمجھانے کو دوسرے وقت پر ملتوی
اور اپنے سمجھانے کے نقص و اصلاح کو مدنظر رکھے۔ ہم مسلمانوں کی اس عادت کو وہ سخت
ناپسند فرماتے تھے کہ بچوں کی ایسی تقریبوں میں جیسے چھٹی، نمک چشی، عقیقہ، ختنہ اور تسمیہ خوانی
وغیرہ میں بہت کچھ خرچ اور پڑھانے کے مصارف میں جن کا نفع بچہ کو عمر بھر پہونچے گا بخل کیا
جائے۔ وہ پٹنہ کے ایک بڑے رئیس و امیر کے یہاں کا چشم دید واقعہ تمثیلاً بیان فرمایا کرتے
تھے کہ ایک روز میں ان سے ملنے گیا اور اُن کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اُن کے اکلوتے بچہ کے
معلم جو شاید دو روپیہ ماہانہ پاتے تھے اس بچہ کے پڑھنے کی گلستان جو میلے گندہ جوتے باندھنے کے
کاغذ پر نولکشور کے مطبع کی چھپی ہوئی تھی لیکر آئے اور کہا کہ یہ پھٹ گئی اور پڑھنے کے قابل
نہیں رہی ہے۔ دوسری منگوا دی جائے۔ اس پر امیر صاحب نے ترش رو ہو کر کہا کہ وہ اس
قدر جلد جلد کتابیں پھاڑا کرے گا تو کہاں سے آئیں گی۔ معلم تو یہ جواب سُنکر چلے گئے لیکن میں
نے اُن سے کہا کہ جس بچہ کی تسمیہ خوانی میں آپ نے بیس پچیس ہزار روپیہ صرف کئے اس کی
تعلیم کا یہ حال ہے کہ دو روپیہ کا تو معلم رکھا گیا ہے جس کی استعداد و قابلیت بھی اُسی دو روپیہ
کے لائق ہوگی اور ایک کتاب منگوانے میں یہ خسّت! اس غیر ضروری بلکہ فضول تقریب میں
جو کچھ خرچ کیا گیا اس سے اس کو کیا نفع پہونچا یا آیندہ پہونچے گا؟ البتہ جو چیز کہ اس کے ہمیشہ
کام آئے گی وہ تو تعلیم ہے اور اس میں آپ کو اس قدر بخل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی
امارت و مقدرت کے لحاظ سے دوبارہ یا سہ بارہ گلستاں کا خرید کر دینا کچھ بھی نہیں ہے لیکن

اصل بات یہ ہے کہ آپ کے نزدیک تعلیمی خرچ کی مد بالکل بیکار اور اسی لئے سخت ناگوار رہے
وہ شرارت کی وجہ سے بھی لڑکوں کا مارنا ناجائز سمجھتے تھے اُن کا قول تھا کہ اس عمر کا فطرتی و
طبعی تقاضا ہی یہ ہے۔ اور جو لڑکا جس قدر ذہین ہوگا اُسی قدر شریر بھی ہوگا البتہ موقعہ سے
تادیب و چشم نمائی ضرور ہے تاکہ گستاخ اور بیہودہ نہ ہو جائے۔ بچوں کی شرارت کے متعلق
اُنھوں نے حیدرآباد میں وہیں کا ایک واقعہ بیان فرمایا اور وہ یہ کہ قاضی صاحب سرسید
کے پاس اُن کے خاص کمرہ میں جو بشیر باغ کے نیچے کی منزل میں تھا بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک
شخص اپنے بارہ تیرہ برس کے لڑکے کو ساتھ لئے ہوئے سرسیّد صاحب کے پاس آئے۔ اثنار
گفتگو میں اُنہوں نے سید صاحب سے اس لڑکے کی نیک بختی، شائستگی، شوق نوشت و خواند،
ذوق تصنیف و تالیف وغیرہ بیان کیا؛ اس پر سیّد صاحب نے کہا کہ یہ سب تو بڑے بوڑھے ہونے
کی باتیں ہیں آخر اس میں لڑکپن کی بھی کوئی بات ہے یا نہیں؟

اُن کلیہ بھی راسخ اعتقاد تھا کہ کوئی آدمی غبی نہیں پیدا ہوا ہے یعنی اللہ تعالےٰ نے کسی کو بیکار
اور نکما نہیں بنایا ہے ہر آدمی میں کسی نہ کسی کام کی خاص صلاحیت واستعداد ہوتی ہے اور جب
وہ کسی ایسے کام میں لگایا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا نہیں ہوا ہے تو وہ غبی معلوم ہوتا ہے،
اسی لئے بعض لڑکے پڑھنے میں نہایت غبی ثابت ہوتے ہیں اور اُن کی اس فطرتی مجبوری کے ساتھ
اُن کے نادان مربّی ان کو مار پیٹ کر پڑھانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہر آدمی پڑھنے لکھنے کے لئے
پیدا نہیں ہوا ہے۔ دانا و عاقل والدین و مربی کو چاہئے کہ وہ بچوں کے ذاتی میلان اور طبعی
رجحان کو غور و خوض کی نظر سے دیکھا کریں اور جس علم و فن یا ہنر کی طرف اُس کو بالطبع راغب
پائیں اُسی کی اُس کو تعلیم دلوائیں تو کچھ شک نہیں کہ وہ خاطر خواہ ترقی کر کے درجۂ کمال کو پہونچ جائے۔

اس کی تمثیل میں وہ یہ تاریخی واقعہ بیان کیا کرتے تھے کہ انگلستان میں ایک لڑکا تھا
جس کے ماں باپ نے ہزار کوشش کی کہ یہ پڑھے مگر اُس کا یہ حال کہ آنکھ بچی اور وہ دریا میں تمام دن
بھر دریا میں نہاتا اور تیرا کرتا تھا۔ چنانچہ برسوں تک وہ پانی کا کیڑا بنا رہا۔ یہاں تک کہ اُس

کی عمر اٹھارہ اُنیس سال کی ہوگئی ۔ اتفاقاً جو گھاٹ اُس لڑکے کا ملجا و ماوی تھا اُس پر اُس
کے ایک جہاز نے آکر لنگر ڈالا ۔ اس میں ایک فلاسفر تھا اس کی توجہ اس کندۂ ناتراش کی
طرف مائل ہوئی ۔ اُس نے جہاں تک کہ اُس کے قیافہ پہ غور کیا یہی سمجھا کہ یہ گریٹ مین (بڑا آدمی)
ہونے والا ہے ۔ لیکن جب اسکو اپنے پاس بلا کر حالات پوچھے تو اُس کو معلوم ہوگیا کہ یہ کتنے پانی
میں ہے ۔ بایں ہمہ اُس حکیم نے اُس کے ساتھ ملائمت اور لگاوٹ کا برتاؤ شروع کیا اور چند ہی
روز میں اُس کو اس قدر اپنا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہوگیا ۔ اس کے والدین
بھی اس سے بیزار ہو کر ہاتھ دھو بیٹھے تھے ۔ اس لئے اُنہوں نے بھی اجازت دیدی ۔ خلاصہ یہ کہ
وہ حکیم اس کو ساتھ لیکر ملک روس پہنچا اس نے ابتدا ہی سے اس کے ساتھ بالکل دوستانہ و بے
تکلفانہ برتاؤ رکھا تھا ۔ اس کی طبیعت کے خلاف اُس پر کوئی فرمائش و تحکم یا جس چیز کو اس
کا دل چاہتا تھا اُس میں کبھی روک ٹوک نہیں کرتا تھا ۔ اثنائے راہ میں اور ملک روس پہنچنے کے
بعد بھی اُس کے ساتھ یہی انداز رکھا اس واسطے وہ لڑکا اس کا دل سے دوست بن گیا ۔

وہاں ایک پادری صاحب تھے جن کی لڑکی نہایت حسین پڑھی لکھی اور شائستہ تھی ۔ اور
فلاسفر اور پادری صاحب سے تعلقات تھے ۔ فلاسفر اپنے ساتھ اپنے نوجوان دوست کو بھی پادری
صاحب کے یہاں لے جانے لگے ۔ چند ملاقاتوں کے بعد اُس لڑکے کو پادری صاحب کی بیٹی کے
ساتھ محبت ہوگئی اور جب بتدریج یہ محبت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تو فلاسفر نے جو اسی تاک
میں لگا ہوا تھا اُس لڑکی کو سکھا دیا کہ اگر یہ شخص تم سے شادی کی درخواست کرے تو تم اُس سے
کہنا کہ تم جاہل و ناخواندہ ہو میرا تمہارا میل کیا ۔ چنانچہ جب اُس معشوقہ کی زبان سے اُس نے
اپنی نسبت ایسے الفاظ سنے تو اُس کی حمیت و غیرت کا دریا جوش میں آیا ۔ اُس نے جان مار محنت
سے پڑھنا لکھنا شروع کیا ۔ پھر تو رات دن وہ اسی میں غرق رہنے لگا ۔ یہاں تک کہ حیرت انگیز
عجلت کے ساتھ جذبۂ محبت کی بدولت پڑھنے لکھنے میں خاصی لیاقت پیدا کرلی ۔ اور جو منزل
برسوں میں طے نہیں ہوسکتی تھی وہ مہینوں میں طے کرلی ۔ جب وہ کسی قدر آدمی بن گیا تو چونکہ

فلاسفر کو اخبار کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سلطنت روس کا ایک بہت بڑا جہاز سمندر میں ڈوب گیا ہے اور اس وقت تک کسی نے اُس کے نکالنے کا قصد نہیں کیا ہے۔ اس لئے اُس پادری کے کبڑے سے کہا کہ دوست میں نے تمہارے مناسب ایک کام تجویز کیا ہے اگر تم اس میں کامیاب ہوگئے تو دفعتہً مالا مال ہوجاؤگے۔ اس تمہید کے ساتھ اُس نے جہاز کے ڈوبنے کا حال بیان کیا۔ وہ فوراً مستعد ہوگیا۔ چنانچہ اُسی فلاسفر نے گورنمنٹ میں درخواست دلوا کر اس کے نام سے معقول شرائط پر اجازت لکھوا دی۔ اور ہزاروں کے خرچ سے ضروری سامان بھی فراہم کر دیے۔ یہ کام چونکہ اُس کی خلقی استعداد کے مناسب اور اس کے سالہا سال کے الفت و عادت کے مطابق تھا اس لئے یہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ خوشی خوشی اس مہم پر روانہ ہوا۔ چھ مہینے تک اُس قرب و جوار میں غوطہ زنی کرتا رہا جہاں اُس جہاز کے غرق ہونے کا پتہ دیا جاتا تھا مگر کچھ سراغ نہ لگا اور گورنمنٹ کی معین کی ہوئی مدت بھی گذر گئی لیکن اُس کے عزم میں مطلق لغزش نہ آئی اور اس ناکامی سے وہ ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوا۔ فلاسفر سے کہہ کر اُس نے جہاز کے ڈھونڈھ نکالنے کی مدت میں چھ مہینے کی توسیع کرائی اور پھر پہلی ہی سی گرمجوشی کے ساتھ سرگرم جستجو ہوا۔ سچ ہے ؎ آخرش جوئیندہ یابندہ بود۔

دوسری مدت کے اندر اُس نے نکال ہی چھوڑا۔ اور ایک دم سے تمام اخراجات ادا کر کے لاکھوں کا مالک ہوگیا۔ پادری صاحب کی بیٹی سے شادی بھی کر لی۔ اور مختلف ممالک کے اور بھی بہت سے ڈوبے ہوئے جہاز اُس نے مختلف سمندروں سے نکالے اور کروڑپتی آدمی ہوگیا اُس کا خسر پادری جب مرنے لگا تو اُس نے بھی اچھی خاصی دولت چھوڑی اور اپنے اُس بلند ہمت داماد کو وصیت کی کہ تم میرے روپے اور اپنی ذاتی محنت و کوشش سے اگر یورپ کی غلامی کی بری رسم کو اٹھاؤگے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری روح کو دائمی راحت پہونچائی اور اپنے لئے غیر فانی ناموری حاصل کی۔ چنانچہ یہی وہ شخص تھا جس نے سخت سے سخت مزاحمتوں اور سارے یورپ کی مخالفتوں سے مقابلہ کر کے اپنی جانی و مالی و لسانی کوششوں سے یورپ سے غلامی

کی رسم کو مٹا کر چھوڑا۔

قاضی صاحب کے جو کچھ خیالات تعلیم کی نسبت تھے اور جس طریقہ کی اور جن چیزوں کی تعلیم بلحاظ ضرورت زمانہ و حالت مسلمانان ہند وہ چاہتے تھے اس کی عملی تمثیل اپنے چھوٹے بھانجے عبدالسلام مرحوم کی تعلیم کے ذریعہ سے اُنہوں نے پیش کی تھی۔ ہر صیغہ اور ہر امر میں اُن کا قول و فعل بالکل مطابق تھا کوئی شخص اُنکے قول و فعل میں ذرہ برابر فرق نہیں بتا سکتا

وہ جو کچھ کہ اپنے لئے چاہتے تھے
وہی ہر بشر کے لئے چاہتے تھے

چنانچہ اس بچہ کی تعلیم و تربیت جس طرح سے اُنہوں نے بذات خود شروع کی تھی اُس کے مطابق ہر آدمی کو بشرط حصول اُن کے اسباب کی جو اُس جان نثار قوم کو حاصل تھے اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کرنا چاہیے۔ جوں ہی وہ ہونہار بچہ پڑھنے کے قابل ہوا کہ قاضی صاحب نے اُس کو اپنے پاس رکھا اور اُس کو اپنے آپ سے اس قدر مانوس کیا کہ اُن کی صحبت اُس کو دل سے مرغوب ہو گئی۔ وہ اُن کی نظر کے سامنے بے خوف و خطر کھیلتا کودتا ہنستا بولتا تھا۔ پھر خود اُس کو پڑھانا شروع کیا لیکن اس طور پر کہ اُس کے دل پر مطلق جبر نہ ہو اور پڑھنے کو بھی کھیل ہی کا ایک جزو سمجھے، جب وہ اُردو کا حرف شناس ہو گیا تو سبق تو خود پڑھاتے تھے مگر آموختہ سننے یاد کرانے اور لکھنا سکھانے کو ایک کم سن طالب علم کو نہ کہ بوڑھے ریش اُمل معلم کو مقرر کیا، اُس کو ہدایت کی کہ کبھی اُس پر جبر و تعدی نہ کیجیے بلکہ اُس کو اس قدر مالوف و مانوس کرے کہ جب وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے کام سے فراغت کرے تو اُس کے ساتھ شطرنج کھیلے اور اُس کو کھیلنا سکھائے۔ اُسی اثنا میں اُس کو ایک دوسرے ماہوار یاب ماسٹر سے انگریزی شروع کرا دی۔ لیکن ہر حال میں یہ خیال رکھا کہ اُس پر اس قدر بوجھ نہ پڑے کہ پڑھنا اُس کو جبر اور بار معلوم ہونے لگے۔ پھر اُس کو انگریزی طرز پر خود عربی بھی پڑھانے لگے۔ یعنی عربی تعلیم کی پرانی طرز کو جس میں سب سے پہلے صرف و نحو پڑھائی جاتی ہے بالکل چھوڑ دیا

اور درایتہ الادب کے بیسوں حصے پڑھا دیے جن میں اعراب دیا ہوا ہے، اور جن میں اسماء اشارہ ضمیریں اور تمام روزمرہ کی چیزوں کی عربی اور معمولی چھوٹے چھوٹے جملے اور پھر چھوٹی چھوٹی نتیجہ خیز کہانیاں درج ہیں۔ اس کے بعد ادب کے ساتھ ساتھ مفتاح الادب کے ذریعہ سے صرف و نحو کی بقدر ضرورت تعلیم دی۔ اس کے بعد اس کو بجائے ادب کی کتاب کے کلام مجید پڑھانا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ برابر انگریزی علم ادب اور حساب کی تعلیم بھی جاری رہی۔ اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ اب یہ تعلیم کے راستہ پر آ گیا اور اس کے دل میں شوق پیدا ہو گیا۔ اور یونیورسٹی کے قاعدہ سے اُس کی تعلیم کا زمانہ آ گیا تو اُس کو ایک ایسے نگراں کے ہمراہ جس پر اُن کو پورا بھروسہ تھا علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں وہ فورتھ کلاس میں داخل ہوا جہاں وہ سکنڈ لینگوج اور انگریزی زبان دانی میں اپنے کلاس میں بہت اچھا ثابت ہوا۔ یہ تو اُس کے لکھنے پڑھنے کی کیفیت تھی۔ اور اس کے ساتھ چال چلن کی یہ حالت تھی کہ تقریباً دو سو بورڈروں میں سے جن میں مختلف سن و سال مختلف دیار و امصار اور مختلف مقدرت و رتبہ کے لڑکے شامل تھے یہ اُن معدودے چند بورڈروں میں شمار کیا جاتا تھا جن کی شائستگی ضرب المثل اور عمدہ ترین نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ یہ خود میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کیونکہ میں خود بورڈر کی حیثیت سے شب و روز اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے متعلق مجھے ایک واقعہ بھی یاد ہے کہ علی گڑھ میں پنجاب کے ایک معزز سرکاری عہدہ دار کے بھیجے ہوئے جن کا آٹھ سال کا بچہ سکنڈ کلاس بورڈر تھا وہاں آئے اور چونکہ اُنہوں نے بورڈنگ ہوس کالج و اسکول اور بورڈروں کو تفصیلی نظر سے دیکھنے کا ارادہ کیا تھا اس لئے اُنہوں نے چند روز وہاں قیام کیا اور وقتاً فوقتاً بورڈنگ کی مختلف بارگوں میں آ کر وہاں کے طلبہ سے ملتے جلتے رہے۔ ایک دن اُس بنگلہ میں آئے جس میں صرف بیٹھے ہی کے بورڈر رہتے تھے اور بہت دیر تک مختلف مضامین کے متعلق راقم سے باتیں کرتے رہے اور برابر عبدالسلام مرحوم اور محمد نصیر الدین سلمہ اللہ تعالیٰ کی حرکات و سکنات طرز نشست و برخاست انداز

مخاطبت ومکالمت کو غور سے دیکھتے رہے اور آخر میں مجھ سے کہا کہ میں جوان لڑکوں کو شائستگی وتہذیب کو اپنے یہاں کے لڑکوں کی حالت سے مقابلہ کرکے دیکھتا ہوں تو اُن میں اور ان میں وہی تفاوت معلوم ہوتا ہے جو یورپین اور عام ہندوستانیوں کی شائستگی میں بچوں کے کھانے پینے کے متعلق اُن کا قول وفعل یہ تھا کہ صحت کی حالت میں کسی قسم کی روک ٹوک کرنا بالکل ناجائز ہے۔ کھانے پینے کے متعلق یہ جملہ کہ "جو رچے سو پچے" یعنی جو چیز مرغوب ہوتی ہے وہی ہضم ہوتی ہے۔ سیکڑوں بار اُن کی صحبت میں بیٹھنے والوں نے سُنا ہوگا۔ وہ فرماتے تھے کہ صحیح آدمی کو یہ کہنا کہ فلاں شئے ثقیل ہے اور فلاں چیز بطی الہضم ہے۔ اس سے خون فاسد پیدا ہوتا ہے۔ اور اُس سے سُدّہ پڑجاتا ہے۔ اس سے جبراً پرہیز کراتا ہے۔ اور جب حالت صحت ہی میں اُس کو پرہیز کرنا پڑا تو بیماری میں اور کیا ہوتا۔ اس کی تمثیل میں ایک لطیفہ بیان فرماتے تھے کہ ایک وہمی شخص اپنے حفظ صحت کا بہت خیال رکھتے تھے اور ایک مرتبہ نقلی کے طور پر اپنے ایک دوست سے کہنے لگے کہ میں اس قدر احتیاط کرتا ہوں کہ میں برس سے مونگ کی دال اور چند چپاتیوں کے سوا کوئی چیز زبان پر نہیں رکھی اور اسی سے کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ اُس دوست نے کہا کہ جب صحت ہی میں ایسے شدید پرہیز کی مصیبت آپ کے سر ہے تو بیماری کے لئے کونسی بات اٹھا رہی۔

ایک مرتبہ میں اُن کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ شام کے قریب آدمی نے سلمت کے سنگترے اُن کے سامنے لاکر رکھے۔ خود کھانے لگے اور مجھ سے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ۔ میں نے کھانسی کا عذر کیا فرمایا کہ نہیں تم کھانا شروع کرو۔ اگر سردی سے کھانسی ہوگی تو چند ہی قاشوں کے بعد کھانسی ہوگی تم فوراً چھوڑ دینا اور اگر نہ ہوئی تو سمجھنا کہ کھانسی حرارت سے ہے اور سنگترے تمہارے لئے مفید ہیں۔ میں نے امتثالاً للامر ڈرتے ڈرتے کھانا شروع کیا اور کوئی حرج محسوس نہ ہوا تو کئی سنگترے کھا گیا جو حقیقت میں میرے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔ تعلیم کے متعلق اُن کے ناصحانہ وحکیمانہ اقوال میں سے ایک یہ قول بھی تھا کہ انسان کی تعلیم کے لئے تین

اسکول ہیں۔ ایک ماں کی گود ابتدائی تعلیم وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرا مکتب و مدرسہ واسکول و کالج وغیرہ یعنی درسگاہیں۔ تیسرا دنیا۔ روزمرہ کے واقعات معمولی وغیر معمولی حوادثات روزمرہ کے انقلابات اور آئے دن کے سوانح سب نہایت زور آور طریقہ سے انسان کو ہر طرح کا سبق دیتے ہیں۔ لیکن ہر آدمی اپنی استعداد و قابلیت حوصلہ و حیثیت ہی کے مطابق ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے چنانچہ یہ شعر وہ اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

چشمے دادند وعالمے درنظرت
دیگر چہ معلم و کتابت باید

انکی تو صحبت تعلیم تھی۔ ان کی صحبت میں اُن کا ایک نوجوان عزیز دہریت کے خیالات رکھتا تھا۔ وہ مطلع ہوئے تو ایک دن دوپہر کو کھانے کے بعد وہ حسب معمول گول کمرہ میں بیٹھ گئے اور اپنے اُس عزیز سے کہا کہ آؤ ہم تم روزانہ مسئلہ توحید پر گفتگو کریں اور اُس کا وقت یہی رہے کہ یہ اطمینان اور تخلیہ کا وقت ہے۔ اُس وقت تک کہ یہ مسئلہ قطعی طور پر یقینیات کے درجہ پر فیصل ہو بحث جاری رہے۔ وہ عزیز بھی مستعد ہو گیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا دہریت کا مسلک میں لیتا ہوں اور توحید کا تم لو۔ بحث شروع ہوئی۔ اس ترکیب سے قاضی صاحب نے اس کو توحید کے دلائل سوچنے اور سمجھنے کی طرف متوجہ اور مشغول کیا۔ دوسرے انہوں نے انسان کے اس خاصہ سے کام لیا کہ جس پہلو کی طرف وہ بحث کرے اُس کا ایسا طرف دار ہو جائے کہ دوسرے کو غلط سمجھے۔ آخر قاضی صاحب نے کامیابی حاصل کی۔

لڑکیوں کی نسبت اُن کی رائے تھی کہ وہ باعتبار لڑکوں کے بہت زیادہ ذہین ہوتی ہیں اور لڑکوں کی طرح بچپن ہی سے پوری مستعدی و سرگرمی کے ساتھ اُن کی تعلیم کی جائے تو اپنے ہم سن لڑکوں سے پڑھنے لکھنے میں وہ ضرور سبقت لیجائیں گی۔

قوت بیانیہ خدا نے ان کو غیر معمولی قوت بیانیہ عطا فرمائی تھی۔ جس مسئلہ اور جس معاملہ کو وہ بیان کرتے تھے وہ ایسے سلجھاؤ اور ایسی سلاست و فطری ترتیب کے ساتھ بیان

کرتے تھے کہ سننے والے کے دل میں وہ بیٹھ جاتا تھا۔ کسی طرح کا کوئی مسئلہ کوئی معاملہ کوئی واقعہ قرآن مجید مثنوی معنوی کے مطالب و نکات تصوف یا شرع کے مسائل۔ الٰہیات یا فلسفہ حکمت کے مسائل یا حساب کے قواعد و اصول خلاصہ یہ کہ سب ہی طرح کے مسائل یکساں طور آسانی کے ساتھ مختلف پہلوؤں اور متعدد تمثیلوں سے سمجھاتے تھے اور اس میں ان کے چہرہ پر برابر شگفتگی و بشاشت قائم رہتی تھی۔ اور مخاطب کے اعتراض کرنے یا نہ سمجھنے سے کبھی چہرہ پر انقباض کا اثر نہ آنے پاتا تھا۔

ان کا قول تھا کہ سمجھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی دوسروں کو بھی سمجھا سکے اور سمجھانے کے سو پہلو ہیں۔ اگر وہ نہیں سمجھا سکتا تو اُس کے نفس نے اُس کو دھوکا دیا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو بھی جاہل سے جاہل کو سمجھا دینے کے مدعی تھے اور سمجھا دیتے تھے۔ لیکن بہت سے غور و فکر کرنے والے اور خصائص انسانی پر نظر غائر ڈالنے والے اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل کریں گے کہ سمجھنے اور سمجھانے کی دو قوتیں جدا جدا ہیں۔ سمجھانے کو سمجھنا لازم ہے۔ لیکن سمجھنے کو سمجھانا لازم نہیں۔ قوت ادراک اور چیز ہے۔ اور قوت بیانیہ اور چیز ہے۔ مختلف لوگوں میں ان دونوں قوتوں کا مد و جزر کافی شہادت ہے۔

ہاں اس میں اختلاف کی جگہ ہے مگر قاضی صاحب کا اصل مطلب یہ ہے کہ جو سمجھا اور سمجھا نہیں سکتا تو یا تو اُس نے جیسا سمجھنا چاہئے سمجھا نہیں اور فریب نفس میں مبتلا ہے۔ یا سمجھانے کی قوت یعنی قوت بیانیہ کا کھوٹ ہے اس صورت میں بھی اُس کے نزدیک سمجھنے کو بیٹھا ہے اس کا سمجھنا نہ سمجھنے کے برابر ہے۔ اور جب سمجھا نہ سکا اور کما حقہٗ بیان نہ کرسکا تو سمجھنے کی کوئی دلیل نہیں رہتی، اور سمجھنے کا دعویٰ بے دلیل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جو سمجھا نہ سکا وہ سمجھا ہی نہیں۔

قاضی صاحب کی وفات

چند روز کی علالت کے بعد قاضی صاحب نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۹۱ء

میں وفات پائی اور صوبۂ بہار اُن کی مخلصانہ خدمات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔

قاضی صاحب کے سوانح زندگی پر مختصر تبصرہ

قاضی صاحب کے سوانح زندگی پڑھ کر ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ علمی حیثیت سے ان کو فضل و کمال کا کوئی درجہ حاصل نہ تھا اس کے علاوہ نہ وہ کوئی جلیل القدر سرکاری عہدہ دار تھے نہ غیر معمولی دولتمند اس عہد میں خود قاضی صاحب کے صوبہ میں بڑے بڑے علما و اہل کمال اور خاندانی امرا و ارباب دولت خاصی تعداد میں موجود تھے، لیکن بایںہمہ قاضی صاحب کی ذات نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور پبلک کے علاوہ حکام بھی اُن کی ممتاز شخصیت اور کیرکٹر کی پختگی سے متاثر تھے، نیز سرسید جیسے جلیل القدر لیڈر کے حلقۂ احباب میں بھی قاضی صاحب کو ایک امتیاز حاصل تھا، آخر اس عزت و امتیاز کے کیا اسباب تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب جس عہد میں پیدا ہوئے اگرچہ وہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا زمانہ تھا، اور اسلاف کی عظمت و شوکت کا خاتمہ ہوچکا تھا، لیکن مشرقی تہذیب و شائستگی کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوا تھا، اور اسلامی سیرت و خصائل کی خوبیاں دلوں میں جاگزیں تھیں۔

اس عہد میں جو بچے اپنے والدین کی بیمائیگی یا دوسرے اسباب کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے وہ بھی اپنے گھروں میں اسلامی تربیت ضرور حاصل کرلیتے تھے، اور اسلامی سوسائٹی اور مذہب کے اثر سے سیرت کی تھوڑی بہت خوبیاں ان میں ضرور پیدا ہو جاتی تھیں خصوصاً اس عہد کے شرفا اپنی خاندانی روایات اور وضعداری کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

قاضی صاحب بھی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شرافت حسب و نسب کے علاوہ مذہبی عظمت بھی رکھتا تھا۔ اس لیے سیرت کی بہت سی خوبیاں جو شرفا کے لئے وجہ امتیاز ہوسکتی ہیں، قاضی صاحب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں، اور ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ان کو اپنے اقران پر ایک امتیاز حاصل تھا اور وہ ہر حلقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور ابنائے وطن کی خدمت نے اس عزت میں اور اضافہ کردیا تھا۔

خانگی تربیت اور اس عہد کے ماحول کی وجہ سے مذہب کی عظمت قاضی صاحب کے دل میں راسخ تھی' اس لئے بمقتضائے فطرت' ایام شباب میں چند روز تک ہوا وہوس میں مبتلا رہنے کے بعد آخرکار انھیں تنبہ ہوا جو ہر سلیم الفطرت وشریف طینت انسان کو کسی نہ کسی وقت ہوتا ہے' اس احساس کے بعد قاضی صاحب نے اپنی زندگی یکسر بدل دی' سب سے پہلے انھوں نے مذہب کو رہنما بناکر اصلاح نفس کا عزم کیا' اورجب استقامت و استقلال کی بدولت اس میں ایک حد تک کامیاب ہوئے تو دوسروں کی اصلاح وخدمت پر توجہ کی جس میں آخری ایام تک مصروف رہے۔

قاضی صاحب نے اگرچہ قدیم طرز پر تعلیم و تربیت حاصل کی تھی' اور ان کی زندگی ایک مذہبی زندگی تھی' مگر وہ متعصب وتنگ نظر نہ تھے' بلکہ ہر جدید چیز پر صبرواطمینان سے غوروفکر کرتے تھے'۔ اور جس کو مفید سمجھتے تھے بے تامل قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے' یہ اسی وسعت نظر وفراخ دلی کا نتیجہ تھا کہ وہ باوجود اختلاف عقائد' قومی خدمات میں سرسید کے شریک کار ہوگئے'

"قومی خدمت" کے الفاظ ہمارے لٹریچر میں تھوڑی مدت سے داخل ہوئے ہیں' اور ان سے ایک خاص مفہوم سمجھا جاتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومی خدمت ایک مسلمان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں' بلکہ یہ اسلام کی اساسی تعلیم ہے کہ جو قوت وطاقت خداتعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے وہ بنی نوع انسان کی فلاح دنیوی ونجات اُخروی میں صرف کی جائے اس لئے ہر راسخ العقیدہ وتربیت یافتہ مسلمان میں جو اسلامی روایات سے واقف ہے کم وبیش خدمت خلق کا جذبہ موجود ہوتا ہے' البتہ اس زمانہ میں اس کے طریقے بدل گئے ہیں'

قاضی صاحب میں بھی خدمت خلق کا جذبہ موجود تھا۔ اگر سرسید مرحوم سے اُن کے تعلقات نہ پیدا ہوتے جب بھی وہ اپنے طریقہ پر خدمت خلق کرتے' لیکن سرسید نے ان کی خدمت کا میدان بدل دیا اور یہ بتایا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھیں اپنی قوت

اپنے خاندان، اور ملک و ملت کے لئے مفید بنایا جائے، چنانچہ قاضی صاحب نے اپنے وقت و دولت کا بڑا حصہ اس خدمت میں صرف کر دیا، اور بقدر اپنی وسعت و استطاعت ابنائے وطن کو کافی فائدہ پہونچایا،

غرض قاضی صاحب کی عظمت و ہر دلعزیزی ان کی اعلیٰ سیرت و خصائل اور خدمت خلق کی وجہ سے تھی، وہ اپنی امانت، دیانت، اخلاص، تحمل، صلح پسندی، اصابت رائے اور دوسرے اخلاقی محاسن کی وجہ سے سب کے معتمد علیہ تھے، اور اپنی خدمت، و فیاضی کی بدولت انھوں نے پبلک کی محبت و ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی، اور ان ہی خوبیوں کی وجہ سے وہ سر سید کے حلقۂ احباب میں داخل ہوئے۔ **قاضی** صاحب کی زندگی کے مطالعہ سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ محض خاندانی شرافت یا امارت ذریعۂ عزت نہیں ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ اخلاقی محاسن بھی نہ ہوں، اور دوسروں کی خدمت کا جذبہ بھی دل میں موجود نہ ہو، وہ نوجوان جو دنیا کے کاروبار اور پبلک لائف میں داخل ہو رہے ہیں، اگر اس نکتہ کو پیش نظر رکھیں تو کامیاب ہوں گے،

ضروری تصحیح:۔ کتاب میں کہیں کہیں کتابت کی خفیف غلطیاں رہ گئی ہیں مگر وہ ایسی ہیں کہ ناظرین آسانی سے اُن کو سمجھ کر صحیح پڑھ سکتے ہیں، لیکن صفحہ اوّل پر جہاں قاضی صاحب کی ولادت کا ذکر ہے غلطی سے سنہ ولادت ۱۳۹۱ھ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح "۱۲۳۶ھ" ہے ناظرین تصحیح فرمالیں،

صولت شیر شاہی

یعنی

سوانح عمری سلطان عادل شیر شاہ سوری رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے اسلامی عہد حکومت کی تاریخ میں شیر شاہ کو جو شہرت و عظمت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اس اولو العزم عادل فرمانروا نے محض اپنی ہمت، شجاعت اور حسن تدبیر سے بہت معمولی حیثیت سے ترقی کرکے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی، اور پھر بڑی قوت، قابلیت، تدبیر اور عدل و انصاف سے حکمرانی کے فرائض ادا کیے، نیز ایسے آئین و قوانین وضع کیے جس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے،

ابتک اس بادشاہ عادل کی کوئی مفصل لائف اردو زبان میں طبع نہیں ہوئی تھی گزشتہ اپریل میں کانفرنس نے یہ لائف شائع کی ہے، جو اصلی و معتبر ماخذوں سے مرتب کی گئی ہے۔

یہ کتاب ایک دیباچہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے، آخر میں ایک بسیط ضمیمہ ہے جس میں آل سور کے حالات بیان کیے گئے ہیں، ان ابواب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کیسے عجیب و غریب دل و دماغ کا فرمانروا تھا، اور اسکے کارنامے و آئین حکومت کس قدر حیرت انگیز و دلچسپ ہیں، مصنف نے شیر شاہ کے اعمال حسنہ اور سیرت و خصلت کو بھی حسن و خوبی سے بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی حکومت کا مقصد ملک و ملت کی خدمت تھی اور وہ حکومت کو خدا کی ایک امانت سمجھتا تھا۔

متعدد ارباب علم نے اس کتاب پر نہایت عمدہ ریویو کرکے اسکے محاسن کا اعتراف کیا ہے۔

کتاب مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے، ضخامت ۱۱۰ صفحے، قیمت بخیال توسیع اشاعت صرف ایک روپیہ۔ عہ

ملنے کا پتہ:- صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل - علی گڑھ

بنظر سہولت ناظرین غلط نامہ درج ہے۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ پڑھنے سے قبل غلطیوں کی تصحیح فرمالیں

صحت نامہ حیات رضا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
دیباچہ	۱۳	عثمانیہ کالج	عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن	۴۴	۹	اس کو مقتضی	اس کی مقتضی
				۴۷	۱۴	اسبتہ	البتہ
۱	۳	سیجری	ہجری	۳۹	۶	میونسپلٹی ٹیٹنہ سے	میونسپلٹی ٹیٹنہ نے
۲	۳	بیلا جو	بیلا	۴۲	۱۳	ڑکاوٹیں	رُکاوٹیں
۳	۱۲	طرف	طرح	۴۳	۶	یافیض	بافیض
۴	۳	منستی	منتہی	〃	۱۷	ادنی الفیض	ادنیٰ فیض
۵	۴	قدردانی کو	قدردانی ان کو	۴۶	۱	خوش رنگی سے سکی	خوش رنگی سے سیاہی
۵	۱۳	سرکاری کمپنی	سرکار کمپنی	〃	۳	کسی	کبھی
۶	۳	پڑانے	پُرانے	〃	۱۲	قاضی سے	قاضی صاحب سے
۶	۴	سے	ملے	〃	۱۲	قاضی کو	قاضی صاحب کو
				۵۵	۱۸	نیکھے میں	پھینکنے میں
۹	۱۱	اس لئے کہ	اس لئے	۵۸	۸	ملصق	ملحق
۱۰	۱	ٹنتے	سُنتے	۶۰	۹	ڈاکٹر سرسید	سرسید
۱۴	۵	ڈونڈی	دوندی	〃	۱۴	ملتا جلتا	ملتا جلتا
〃	۱۲	سے	لے	۶۵	۱۶	اُس کی	اُن کی
۲۰	۱۰	بڑا	بُرا	۶۷	۷	سلت طب	سیلف ہلپ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۷	۲۱	حد کو	حد کی
۶۹	۱۶	بونی لگاہ	جولانگاہ
۷۰	۱	ہے	سے
۷۱	۴	مشرورہ	مغرور
"	۲۱	مگرمی	مُکرمی
۷۲	۱۱	یہی اُن کا یہی	یہی اُن کا
۷۳	۹	ٹھلے	ٹھلتے
۷۲	۱۳	باسکے	پاسکنے کو
۷۸	۹	۷۹	۷۸
۸۴	۱۹	طبعی خاص	طبعی خلوص
۸۸	۴	گھرسے	گھر سے
۸۸	۱۷	بجالانے اصل	بجالانے کو اصل
"	۲۰	عایت	غایت
۹۰	۱۵	بیان کرنے	بیان کرنا
۹۵	۷	الیف	الف

پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا رزولیوشن متعلق کانفرنس گزٹ

پراونشل کانفرنس کے اجلاس دہم منعقدہ علی گڈھ ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب بار ایٹ لا ایم ایل سی نے کانفرنس گزٹ کے متعلق ایک خاص رزولیوشن پیش کیا اور مولوی ابوالحسن صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس صوبہ متحدہ نے اس کی تائید کی محرک و موئد نے اس رزولیوشن کے متعلق زبردست تقریریں کیں اور حاضرین کو بتایا کہ کانفرنس گزٹ کس قدر مفید اخبار ہے، یہ رزولیوشن جو تمام حاضرین اجلاس کی تائید سے پاس ہوا حسب ذیل ہے:-

رزولیوشن نمبر ۱۱

"یہ کانفرنس اس امر کو بہ نظرِ استحسان دیکھتی ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تعلیمی و اصلاحی اغراض نیز اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنا اخبار کانفرنس گزٹ جاری کیا ہے جو اپنے مفید و پر مغز اصلاحی مضامین کی بنا پر اہل علم کی ستائش حاصل کر چکا ہے چونکہ ہر انسٹی ٹیوشن کے لئے ایک آرگن کی ضرورت مسلم ہے، یہ کانفرنس اس اخبار کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے پبلک کو اس کی مالی و اخلاقی اعانت پر متوجہ کرتی ہے، نیز نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں بالقابہ کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ ممدوح نے سنہ رواں میں کانفرنس گزٹ کو پانسو روپیہ عطا فرما کر اس کی بنیاد کو مستحکم فرمایا۔"

کانفرنس گزٹ کا نمونہ حسب ذیل پتہ سے طلب کیجئے۔

دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی و نفاست سے، اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ قیمت سالانہ ۸؍ عہ

اڈیٹر: محمد اکرام اللہ خاں ندوی

حسب ذیل پتہ سے طلب کیجئے:۔

مینجر کانفرنس گزٹ علی گڑھ